منیر نیازی اور پی بی شیلے کے

شعری میلانات

کونب گھمن



Muneer Niazi aur P.B. Shelley Kay

Sheri Mailanaat

Konab Ghumman

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کومل سی کونب کے قلم سے نکلنے والے الفاظ اتنے نپے تُلے اور موثر ہوں گے مگر مسودہ دیکھا تو اندازہ ہوا کہ کونب گھمن نہ صرف تحقیق وتنقید کے اصولوں سے پوری طرح واقف ہیں بلکہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر بھی عبور حاصل ہے۔انھوں نے جس انداز سے منیر نیازی اور پی بی شیلے کی شعری جہات پر قلم اٹھایا ہے وہ ان کے شعری ذوق کا عمدہ نمونہ ہے۔کونب گھمن انگریزی زبان میں شاعری کرتی ہیں۔اس سے قبل ان کی انگریزی شاعری کی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔کونب انگریزی اور اردو کی روایت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پس منظر اور پیش منظر دونوں کو سامنے رکھ کر اپنی اپنی زبان کے دونوں معروف شعرا کے فنی وفکری محاسن و معائب کو دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے۔اس ابتدائی کاوش کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اگر کونب گھمن نے اس سفر کو جاری رکھا تو تحقیق کے میدان میں ضرور نام کمائیں گی۔اللہ پاک انھیں استقامت دے اور وہ مزید کامیابیاں سمیٹیں۔آمین

پروفیسر ڈاکٹر مشتاق عادل

صدرِ شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ

فروغِ زبان پبلشرز ساہیوال

9 789697 988228

حُسنِ اَدب پبلشرز فیصل آباد
0321-7044014
0301-7044014
rawisharifhussain@gmail.com
Street No 9, Makkuana Jaranwala Road Faisalabad

منیر نیازی اور پی بی شیلے کے

شعری میلانات

کونب گھمن

حسنِ ادب ، فیصل آباد
0321-7044014

Muneer Niazi aur P.B Shelley kay
(Sheri Mailanaat)

By

Konab Ghumman

ضابطہ

نام کتاب:	منیر نیازی اور پی بی شیلے کے شعری میلانات
شاعر :	کونب گھمن
کمپوزنگ:	غیور عباس، شعور عباس
نظر ثانی :	ڈاکٹر مشتاق عادل
سرورق :	ڈاکٹر عارف حسین عارفؔ
ناشر :	حسنِ ادب فیصل آباد
باراول :	2023
تعداد :	100
قیمت :	800 روپے

انتساب

اللہ

کی بابرکت ذات کے نام

حسنِ ترتیب

پیش لفظ

''منیر نیازی اور پی بی شیلے کی شاعری کا تقابل'' کرنے کا تجربہ میرے لیے دو شاعروں کا نہیں بلکہ دو مختلف ادوار اور مختلف کلچروں کا تجربہ ہے جو کہ بہت منفرد اور تخلیقی صلاحیت کو بڑھانے کے لیے مفید ہے۔میرے اس تقابل کا مقصد دونوں کی شعری خصوصیات کو جاننا اوران کی تخلیقی صلاحیت کو داد دینا ہے۔اس کا پیش لفظ لکھتے ہوئے مجھے بہت کچھ یاد آرہا ہے۔میرا یہ ایم۔فل کا سفر کیسے اور کیوں شروع ہوا۔اس سفر میں کس نے میرا ساتھ دیا۔ میں سب اساتذہ اوراس سفر میں قدم قدم پر راہنمائی کرنے والے سب لوگوں کی بہت مشکور ہوں۔ میں ڈاکٹر مشتاق عادل صاحب کی بہت مشکور ہوں کیونکہ مجھے مشکل سے کسی کی بات سمجھ آتی ہے مگر ڈاکٹر صاحب کی ملی جلی پنجابی اور اردو زبان نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کے ساتھ اس سفر کو بھی آسان کر دیا۔اس سفر میں مجھے اندازہ ہوا کہ ہماری زبان اردو بہت باادب ہے جو زندگی کے بڑے بڑے مسائل کو نرم الفاظ سے سلجھا سکتی ہے مگر اس سے دوری ہمارے معاشرے کے اندر گھٹن اور بے ادبی بڑھا رہی ہے۔یہ محسوس کرنے کے بعد میں ہر کسی کو ایک مفت مشورہ دینا چاہوگی کہ "مہربانی فرما کر اردو بولیے، اردو سیکھیے اور اردو سنیے"۔

میں اپنے والد صاحب کی ہمیشہ مشکور رہوں گی جو زندگی کی دھوپ میں ہمیشہ گھنے سایے کی طرح رہے۔میرا بھائی جس نے میرے ایم۔فل کے پورے سفر میں مجھ سے زیادہ محنت کی اور ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔جس کا شکریہ ادا اس کے سامنے شاید میں کبھی نہ کروں۔

آخر میں، میں ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جو اس سفر میں میرے ساتھ چلے۔مس ریحانہ کامران، مس نادیہ ظفر، مس حمیرا خانم، مس فوزیہ ناہید، مس فرح ادیبا اور مس راحیلہ خاتون یہ سب وہ لوگ ہیں جن کا میں کبھی الفاظ میں شکریہ ادا نہیں کر سکتی کہ ان لوگوں نے میری شخصیت کو بہتر کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

کونب گھمن

☆

اک اور دریا کا سامنا تھا منیؔر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

منیر نیازی: سوانح وتخلیقات

منیر نیازی اپنے اسلوب، طرز بیان، منفرد احساس اور فکر وفن کے اعتبار سے اردو اور پنجابی کے معروف شاعر ہیں۔ دوسرے شعراء کی نسبت ان کا لہجہ انوکھا اور بہت سوں سے مختلف ومنفرد ہے۔ وہ اپنے اندازِ فکر کے تخلیق کار ہیں۔ ان کے طرز بیان اور شعری سخن کی پیروی کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے پنجابی اور اردو شاعری کے حوالے سے دور حاضر میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے اور بین الاقومی سطح پر پاکستانی ادب کے اعتبار و وقار میں اضافہ کیا ہے۔ اپنی شاعری کی بدولت قارئین کے دلوں میں اہم مقام بنانے والے منؔیر نیازی ایک قابل ادیب اور ان کا شعری سخن ایک ''سکول آف تھاٹ'' ہے، جہاں بند دروازے، کھلے دریچے، ہیولے، پرچھائیں، دیواریں، موسم، اداسی، منتظر نگاہیں، ویران گلیاں، گھپ اندھیری رات، ڈری سہمی یادیں، ہوا کی سرسراہٹیں، ابدی جدائی اور مناظر فطرت یہ سب ان کے کلام میں بولتا، گونجتا اور احساسات پر اس طرح حاوی ہوجاتا ہے کہ قارئین ان کے سحر میں گم ہوجاتا ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور ان کے حصار سے بچنا بہت مشکل ہے۔

منیر نیازی کی ابتدائی زندگی کی بات کی جائے تو وہ 9 اپریل 1923ء کو مشرقی پنجاب کے شہر ہوشیار پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد محمد فتح خان محکمہ انہار میں ملازم تھے، جبکہ ان کے خاندان کے باقی افراد عسکری اور ٹرانسپورٹ کے شعبہ سے منسلک تھے۔ منؔیر نیازی کی عمر ایک سال تھی جب ان کے والد کی وفات ہوئی۔ ان کی پرورش ان کی والدہ اور چچاؤں نے کی۔ ان کی والدہ کو ادب سے لگاؤ تھا اور وہ کتابیں بہت شوق سے پڑھتی تھیں اور یہیں سے ادبی ذوق ان کی شخصیت کا حصہ بنا۔ بچپن ہی سے ان کو جب بھی کچھ انوکھا یا مختلف لگتا، تو وہ اسے اپنے اندازِ فکر میں لکھنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے نظم اور غزل کے ساتھ افسانے بھی لکھنے کی سعی کی مگر پھر غور وفکر کے بعد خود ہی انھوں نے افسانے نہ لکھنے کو ترجیح دی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم منٹگمری (موجودہ ساہیوال) سے حاصل کی اور میٹرک کا امتحان

پاس کر کے نیوی کے شعبہ میں بطورِ سیلر ملازمت شروع کی، لیکن یہاں کے اصول وقوانین ان کی شخصیت سے مختلف تھے۔ ملازمت کے دوران وہ بمبئی کے ساحلوں پر اکیلے بیٹھ کر میرا جی کی نظمیں اور منٹو کے افسانے پڑھتے تھے۔ اسی دوران ان کے ادبی شوق کو تقویت ملی اور انھوں نے ملازمت کو ترک کر دیا اور اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کی طرف توجہ دی۔ ساتھ ہی منیر نیازی نے لکھنے کا سلسلہ باقاعدہ شروع کیا۔ لاہور کے "دیال سنگھ کالج" سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور اُسی زمانے میں چند انگریزی نظمیں بھی لکھیں۔ منیر نیازی نے اپنے بارے میں کچھ اس طرح کہا کہ انھوں نے تمام عمر شاعری کی اور شاعری کے علاوہ کوئی کام نہ کیا۔

ان کی شخصیت کی بات کی جائے تو وہ ایک وجیہہ شخص تھے۔ لمبا قد سرخ وسفید رنگ، پٹھان کی طرح تیکھے نقوش، متناسب جسم اور پُر تاثر آواز یہ سب عناصر منیر نیازی کی شخصیت کو مسحور کن بناتے تھے۔ وہ جس محفل میں شریک ہوتے، مرکز نگاہ بنے رہتے۔ منیر نیازی کے ایک ہم عصر "رحیم گل" نے نہایت خوبصورتی سے ان کی ظاہری شخصیت کا خاکہ کھینچا ہے:

> ''ربع صدی قبل میں ایک نوجوان سے ملا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سیاہ وسرخ قمیض میں اس کا چہرہ اور زیادہ سرخ نظر آتا تھا۔ اس کے سیاہ بال بانکپن سے اس کی پیشانی پر لہرا رہے تھے نیلگوں بھوری سی دو بڑی شفاف آنکھیں اس کے چہرے پر یوں جھلملا رہی تھیں جیسے سرخ ماربل میں سے دو چشمے ابل پڑے ہوں۔ ستواں ناک مگر نتھنے کچھ زیادہ کشادہ غالباً یہی وجہ تھی کہ اس کی قوت شامہ بہت تیز تھی اور وہ فطری طور پر بوئے گل اور مانس بو کی مکروہات اور خصوصیات پا لیتا تھا۔ پہلی ملاقات میں منیر مجھے اچھا لگا (1)

منیر نیازی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی صغریٰ خانم نامی خاتون سے ہوئی انہوں نے اپنی پہلی کتاب ''پہلی بات ہی آخری تھی'' کا انتساب اپنی پہلی بیوی کے نام کیا ہے صغریٰ خانم کا انتقال 1958ء میں ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری شادی ناہید نامی خاتون

سے 30 دسمبر 1958ء میں کی۔ ان دو شادیوں کے باوجود وہ اولاد کی سعادت سے محروم رہے۔

منیر نیازی نے بطور شاعر اردو دان طبقوں میں عالمی شہرت حاصل کی۔ وہ شعر پڑھنے کے لیے دنیا کے گوشے گوشے میں مدعو کیے جاتے رہے۔ اگر یہ بات کہی جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ جہاں بھی اردو شاعری کے قارئین موجود ہیں وہاں منیر نیازی کے مداحین بھی ضرور مل جاتے ہیں۔ کسی بھی ادیب کے فنی اور تخلیقی سفر کو سمجھنے کے لئے اس کے اردگرد کی دنیا کو اپنے دھیان میں رکھنا ضروری ہوتا ہے خاص طور پر وہ تہذیبی اور سماجی کے حالات و واقعات جن میں کسی لکھنے والے کی ابتدائی زندگی گزری ہو۔ بچپن سے لے کر جوانی کا ماحول، وہ لوگ جن کے ساتھ زندگی گزاری ہو، ان افراد اور ماحول کے واضح اثرات ان کی شخصیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ منیر نیازی کی شخصیت کو پرکھنے کے لئے بھی ان کے عہد کے طور طریقوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

منیر نیازی کی شخصیت اصولوں اور ضابطوں میں ڈھلنے کے لیے نہ تھی۔ آزادروی اور بےفکری ان کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ ملازمت کے بارے میں کم ہی سوچتے تھے اور کبھی کسی ملازمت کا خیال بھی ذہن میں آیا تو چند ثانیوں سے زیادہ نہ رہا۔ پاکستان کے قیام کے بعد انھوں نے ساہیوال میں اشاعتی ادارے کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کا نام "ارژنگ پبلشرز" تھا۔ اس ادارے کے تحت انہوں نے پہلے ایک ہفت روزہ رسالہ "سات رنگ" کے نام سے شائع کیا۔ انھوں نے ایک سہ ماہی پرچہ ارژنگ کے نام سے بھی شروع کرنے کی کوشش کی مگر ذاتی معاملات اور مالی حالات کی وجہ سے جلد ہی یہ ادارہ بند ہو گیا۔ منیر نیازی نے شاعری کا آغاز پاکستان بننے سے پہلے اس وقت کیا جب وہ بی اے کے طالب علم تھے۔ انہوں نے حسن رضوی کو انٹرویو دیتے ہوئے 1947ء کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا:

''میرے خیال میں پہلی 1947ء کے آس پاس آنکھ کھلی جیسے
کچھ یکلخت آتا ہے بوچھاڑ کی صورت آنے والے واقعات کا
پیش خیمہ تھا۔ ہجرت کے آثار تھے یا کیا تھا؟ اس وقت میں

اسلامیہ کالج میں تھا۔ ہمارا مجلّہ مجاہد نکلتا تھا اس میں ایک نظم،
ایک افسانہ اور ایک انگریزی کی ہوئی تھی۔(2)

انھوں نے ایک اشاعتی ادارہ "المثال" کے نام سے لاہور میں قائم کیا۔ جس سے کچھ کتابوں کو بہت اہتمام سے شائع کیا گیا جن میں ن م راشد کی کتابیں شامل ہیں اس طرح کے اداروں کو چلانے کے لئے کاروبار کی سمجھ بوجھ ہونی چاہیے تاکہ تسلسل قائم کرنے کے لئے نفع نقصان کا خیال رکھا جائے۔ ایک ادبی شخص کے لئے ایسے اداروں کو چلانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ منیر نیازی کے ساتھ بھی یہ ہی ہوا۔ ان کی شخصیت میں کاروباری داؤ پیچ نہ تھے۔ وہ سادہ اور تخلیقی صفت کے انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اس ادارہ کو چلانے میں مشکل پیش آئی اور آخر کار اسے بند کرنا پڑا۔ منیر نیازی نے ایک اور کوشش " مکتبہ منیر" کے نام سے کی مگر یہاں بھی وہی ہوا کہ ایسے ادارے کو چلانے کے لئے انسان کو کاروباری گُر اور طریقے آنے چاہییں جبکہ منیر نیازی کی شخصیت مختلف تھی۔

ساہیوال میں ان کا انجم رومانی، مجید امجد اور صدیق کلیم جیسے شعراء سے ربط وضبط کا موقع ملا۔ منیر نیازی ان میں سے سب سے زیادہ مجید امجد سے متاثر ہوئے اور ان کی شخصیت کے اثرات قبول کیے۔ 1950ء میں منیر نیازی لاہور منتقل ہو گئے اس کے بعد جدید بستی ماڈل ٹاؤن اور پھر ٹاؤن شپ لاہور میں رہائش پذیر ہوئے۔ اسی دوران رفتہ رفتہ ان کی شاعرانہ شہرت پھیلنے لگ گئی جلد ہی منیر نیازی اپنے ہم عصروں میں نمایاں چمکنے لگ گئے۔ وہ حلقہ ارباب ذوق کے رکن بنے۔ حلقہ ارباب ذوق لاہور کے سیکرٹری کے درجے پر بھی فائز رہے۔ ان کا تعلق حلقہ ارباب ذوق سے کسی نہ کسی طرح قائم رہا۔ اس کے علاوہ دیگر ادبی تحریکوں سے زیادہ تعلق نظر نہیں آتا۔ انھوں نے مختلف اخبارات اور ریڈیو پروگرام کے لیے بھی کام کیا۔ 1960ء کی دہائی میں انھوں نے فلمی گیت لکھے، 1962ء میں منظر عام پر آنے والی فلم "شہید" کے لیے انھوں نے گیت ''اُس بیوفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو''، لکھا جسے "نسیم بانو" نے گا کر لازوال کر دیا۔ اُسی سال مہدی حسن کی آواز میں یہ گانا ریکارڈ کروایا گیا "جس نے مرے دل کو درد دیا، اُس شخص کو مَیں نے بھلایا نہیں" جو کہ فلم "سسرال" میں شامل کیا گیا۔

اُسی فلم میں میڈیم نور جہاں نے "جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا" کو گایا جو بہت مقبول ہوا۔ 1976ء میں فلم "خریدار" کے لیے ناہید اختر کی آواز میں گیت "زندہ رہیں، تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا" بھی بہت زیادہ مقبول ہوا مگر بعد میں انھوں نے فلمی گیت نہ لکھے اور وہ مکمل طور پر اپنی ادبی شاعری میں غرق ہو گئے۔

ان کے یہاں زندگی کی تبدیلیوں کے متعلق خوف اور تکلیف نظر آتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہجرت کے عمل سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھرنے میں مدد کی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں پرانی بستی کے گھروں، گلیوں، راستوں کے نشان اور اُجڑے دیار کے نقش ملتے ہیں۔ منیر نیازی کے یہاں ہجرت کا تجربہ، داخلی و خارجی ہجرت کے نتائج، دوستوں کے بچھڑنے، زندگی اور تہذیب کے ایک حصے کے گم ہو جانے کا احساس ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام سے یہ بات بھی باور کرانے کی کوشش کی کہ آزادی کے بعد دو ہجرتیں ہوئی ہیں۔ ایک وہ جس کے بعد پاکستان وجود میں آیا اور دوسری وہ جو بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں ہوئی لیکن دونوں میں ایک نمایاں اور بڑا فرق ہے۔ پہلی ہجرت اپنی جان اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے اور دوسری ہجرت میں اپنے آرام اور آسائش کے لیے مغربی ممالک کی طرف کی گئی۔ وہ دوسری ہجرت کا منظر نامے پیش کرتے ہوئے دکھی اور غم زدہ ہے۔

انھوں نے ادبی کالم نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ "منوچہر" کے قلمی نام سے ادبی کالم لکھے جو کہ رسالے 'نصرت' میں فروری 1961 سے اپریل 1964 تک وقفے وقفے سے دو کتابوں میں محفوظ ہوئے۔ جبکہ انھیں کالموں کو ڈاکٹر صدف بخاری نے 2014ء میں 'باب گزری صحبتوں کا' کے عنوان سے کتابی شکل میں ترتیب دیا۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز کی مرتب کردہ ''کلیاتِ نثرِ منیر نیازی'' (2017) میں بھی یہ کالم شامل ہے۔ فاطمہ حسن "سیہ شب کے سمندر" کے دیباچے میں لکھتی ہے:

> "منیر نیازی کی شاعری کو ان کی نسل اور بعد کی نسل دونوں نے محسوس کیا ہے۔ ان کے لہجے میں ایک معصوم بچے کی حیرت ہے۔ یہ حیرت بہت سے سوالات، آئندہ کے اندیشے،

گزرے دنوں کے افشاں ہوتے راز، جو ہو رہا ہو وہ، جو ہو نہ سکا وہ بھی، غم و غصہ، پیار و نفرت، لا حاصلی کا احساس اور کچھ حاصل ہونے کی مسرت، یہ تمام کیفیات ہمیں منیر نیازی کی شاعری میں خوبصورتی سے سمٹتی نظر آتی ہیں جبھی انھیں پڑھ کر ایک سرخوشی کا احساس ہوتا ہے۔"(3)

ان کے کلام کے مطالعہ سے ان کی تخلیقی قابلیت کا احساس ہوتا ہے۔ان کے ہاں روایت اور انفرادیت کا خوبصوت امتزاج ملتا ہے۔ان کے گیتوں میں تذکیر و تانیث کی روش پائی جاتی ہے۔وہ مرد کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کلاپے اور وجودی کرب کی کیفیت کا اظہار کرتے ہے۔ان کی غزلوں اور نظموں میں تنہائی اور وجودیت مرکز ہے۔

1970ء کی دہائی میں منیر نیازی نے پاکستان ٹیلی ویژن پر پروگرام بھی کیے۔ان پروگراموں میں ڈاکٹر محمد اجمل اور پروفیسر اشفاق علی جیسے لوگوں کی میزبانی کے فرائض سرانجام دیئے۔اسی طرح وہ پاکستان ٹیلی ویژن کے ایڈوائزر کے طور پر بھی کام کرتے رہے لیکن اس ایڈوائزرشپ کی نوعیت زیادہ تر اعزازی قسم کی تھی۔منیر نیازی کو ان کی شاعرانہ خدمات پر بہت پہلے ادبی اور علمی ایوارڈز مل چکے ہیں۔سرکاری اور غیر سرکاری دو طرح کے اداروں نے ان کی تخلیقی خدمات کا اقرار کیا ہے انہیں بعض عالمی اداروں نے بھی اپنے اعزازات سے نوازا ہے۔ عمر کیا آخری حصے میں ان کو سانس کا مرض ہو گیا اور اسی مرض سے 26 دسمبر 2006ء کو وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ان کی خدمات کے اعتراف پر حکومتِ پاکستان نے انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی، ستارۂ امتیاز اور اکادمی ادبیات پاکستان نے کمالِ فن ایوارڈ سے نوازا۔ان کو لاہور ماڈل ٹاؤن قبرستان میں دفنایا گیا۔

ان کے کلام میں فکر انگیزی، رفعت، سنجیدگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے ان کے کلام میں فلسفیانہ فکر کی انفرادیت پائی جاتی ہے۔شاعری اس انداز سے پڑھتے کہ سننے والا داد دیے بغیر نہ رہ سکتا۔ان کی شاعری رومانی ہونے کے علاوہ عمدہ اور منفرد تصورحیات کے ساتھ نہایت پختہ اہمیت کی حامل ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں جو تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا کسی اور

کے ہاں کم ہی ملتا ہے۔ وہ بے باک ہونے کے ساتھ عام الفاظ میں انسانی رشتوں کی گہرائیوں کے ساتھ جذبوں کا ارتفاع بھی کرتے ہے۔انھوں نے وسعت آمیزی اور حقیقت کو اپنے انداز اور منفرد لب و لہجے سے پیش کرتے ہیں۔

اُردو میں انھوں نے 13 اور پنجابی میں 3 شعری مجموعے یادگار چھوڑے، جن میں ''چھ رنگین دروازے''،''اُس بے وفا کا شہر''،''ماہِ منیر''،''تیز ہوا اور تنہا پھول''،''دشمنوں کے درمیان شام''،''جنگل میں دھنک''،''سفید دن کی ہوا''،''آغاز زمستاں میں دوبارہ''،''سیاہ شب کا سمندر''،''ساعت سیار''،''پہلی بات ہی آخری تھی''،''ایک دعا جو میں بھول گیا تھا''، ''محبت اب نہیں ہوگی'' اور ''ایک تسلسل کے نام'' شامل ہیں، پنجابی شاعری کے مجموعے ''چار چپ چیزاں''،''رستہ دسن والے تارے'' اور ''سفر دی رات'' کے نام سے اشاعت ہوئے۔

چھ رنگین دروازے:

"چھ رنگیں دروازے " جس میں ان کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس کے مطالعے سے پہلا تاثر یہ پڑتا ہے کہ شاعر اپنے تجربات کے کمالات دکھا رہا ہے مگر مزید مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا کلام جذبات واحساسات کے رنگوں سے سجا ہوا ہے۔ جو محض مشاہدے کی شاعری نہیں، بلکہ مشاہدات تو صرف ان کے محسوسات کے لیے پس منظر فراہم کرتے ہیں۔انھوں نے کلام میں فارسی اور اردو شاعری کی خاص اصطلاحات وتراکیب کا استعمال ہے لیکن لفظیات ان کی اپنی ہے۔1979ء میں شائع ہونے والے اس مجموعے کا تعارف احمد ندیم قاسمی نے لکھا جس میں 23 کے قریب غزلیں اور 37 نظمیں ہیں۔اس مجموعے کو حمد اور نعت سے شروع کیا گیا ہے۔

تیز ہوا اور تنہا پھول:

پہلی دفعہ یہ مجموعہ 1959 میں شائع ہوا جبکہ 1994ء میں گورا پبلشرز، لاہور سے شائع ہوئی۔اس کا دیباچہ "سر کہسار" کے نام سے "اشفاق احمد نے لکھا۔اس میں شامل نظمیں منیر نیازی کی باریک بینی اور گہری سوچ کو واضح کرتی ہے۔ اس مجموعے میں 2 قطعات،

10 غزلیں، 8 گیت اور 60 کے قریب نظمیں ہیں۔

دشمنوں کے درمیان شام:

اس میں منیر نیازی کی تیز دھار انفرادیت ہے جو پھیل کر انانیت تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ وہ خاص واردات، خاص تجربات کی انا ہے۔منیر نیازی کی شاعری بظاہر بہت سلیس، بہت سیدھی سادی ہے مگر بین السطور اتنی ہی گھمبیر ہے۔اس کا تعارف انتظار حسین اور محمد سلیم الرحمٰن نے لکھا۔اس مجموعے میں 20 غزلیں اور 36 نظمیں ہیں۔ یہ مجموعہ 1968 میں شائع ہوا۔

جنگل میں دھنک:

اس مجموعے کو منیر نیازی نے "قدرت اللہ شہاب" کے نام کیا۔جبکہ اس کا تعارف "مجید امجد" نے لکھا۔1963 میں اس کو شائع کیا گیا۔اس میں مجموعے میں 10 گیت، 21 غزلیں اور 69 نظمیں شامل ہیں۔

آغاز زمستاں میں دوبارہ:

اس شعری مجموعہ کی غزلیں چھوٹی چھوٹی بحر میں انتہائی دلکش ہیں۔ چھوٹی بحر کی ایک نظم " جگنو چمک رہا ہے " میں منیر نیازی نے ایک کمزور مخلوق کے طرز زندگی کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔کتاب میں شامل غزلیں متوسط بحر کی ہیں اور غزلوں کے اشعار سماجی رنگوں میں رنگے ہوئے ہیں۔ ایک بھاری رات، شروع سال کی بارش، سورج گرہن اور حرف سحر خیز جیسے عنوان اس مجموعہ میں شامل ہے۔ 1981ء میں یہ مجموعہ شائع ہوا اور شاعر نے اس مجموعے کا انتساب اپنے مرحوم والد کے نام کیا۔اس میں 14 غزلیں اور 26 نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ چند پنجابی نظموں کا ترجمہ بھی شامل ہے۔

سفید دن کی ہوا اور سیاہ شب کا سمندر:

یہ منیر نیازی کا بہت مشہور شعری مجموعہ ہے اس کا دیباچہ "فاطمہ حسن" نے لکھا۔ان کے کلام میں انسان کی داخلی و خارجی کیفیات کے مناظر ہیں۔اس میں شاعر نے 5 غزلیں،

22غزلیں اور چند متفرق مصرے شامل کی ہیں۔

پہلی بات ہی آخری تھی:

پہلی بات ہی آخری تھی"منیر نیازی کا مقبول شعری مجموعہ ہے۔اس میں ایک نظم کا عنوان بھی" پہلی بات ہی آخری تھی" کے نام سے ہے۔ان کے یہاں حقیقی رومانویت ہے۔منیر نیازی اپنے اسلوب طرز احساس اور زبان و بیان کے اعتبار سے ایک منفرد شاعر ہے۔ "پہلی بات ہی آخری تھی" 1986 میں جامعہ ہمدرد، دہلی سے شائع ہوئی۔اس مجموعے کو حمد اور نعت سے شروع کیا گیا۔اسی مجموعے میں ایک نظم اپنی مرحومہ بیوی کے نام " میں اور صغریٰ" لکھی۔

ایک تسلسل کے نام:

یہ مجموعہ 2004ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

کلیات منیر:

کلیات منیر پہلی دفعہ 1987ء شائع ہوا۔اور اس مجموعے کو ان کی بیوی ناہید منیر نیازی نے مرتب کیا۔جبکہ اس کا تازہ ایڈیشن 2002ء میں لاہور سے شائع ہوا اور اس میں سفید دن کی ہوا اور سیاہ شب کا سمندر تک مجموعے شامل ہیں۔

ایک دعا جو میں بھول گیا تھا:

الحمد پبلشرز نے اس مجموعے کو شائع کیا،اس کا انتساب ناہید منیر نیازی کے نام لکھا گیا اور اس مجموعے کی پہلی نظم کا نام "ایک دعا جو میں بھول گیا تھا" ہے۔اس میں 40 نظمیں اور 10 غزلیں ہیں۔یہ 1991 میں شائع کی گئی۔اس مجموعے میں " جاگنے کی دھند"،سدا کا المیہ "اور "ہرا درخت" جیسی نظمیں شامل ہیں۔

ماہِ منیر:

اس مجموعے کے بار یمیں سہیل احمد لکھتے ہے۔"ماہ منیر" کھلے منظروں کی کائنات ہے۔اس کے گیتوں میں چمک نظر آتی ہے۔1974ء میں شائع ہونے والے اس مجموعہ کا

انتساب رسول کریم ﷺ کے نام کیا گیا۔ ان نغموں اور غزلوں میں جو تصویریں بار بار سامنے آتی ہے وہ اسی روشنی اور چمک سے مناظر کی رنگت تبدیل ہونے کی داستان بیان کرتی ہے۔ یہاں نیلے سمندر اور اس دھوپ کے شیشے کی چمک کا رشتہ بھی ملتا ہے اور کسی چشم نم پر مہر کی اولین کرن کا اثر بھی، خورشید سے چمکتے ہوئے دریچے بھی ہیں اور چاند کی روشنی کا مکانوں کی سیہ رنگت کے ساتھ پراسرار رابطہ بھی۔

ساعت سیار:

اس مجموعے کو 1983ء میں مکتبہ منیر سے شائع کیا گیا۔ اس کے ابتدائی حصے میں حضرت امام حسین کی تعریف شامل ہے۔ ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ان کی اختصار پسندی ہے۔ وہ۔ شاعری میں داخلی واردات کو یوں سموتے ہے کہ وہ چلتی پھرتی تصویر بن جاتی ہے۔ اس مجموعے کی اہم نظمیں "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں"، "لمحہ لمحہ دم بہ دم"، اور "نئے رشتوں کی کھوج" ہے۔ اس علاوہ اس مجموعے کا دیباچہ فیض احمد فیض نے لکھا۔

منیر نیازی نے پنجابی شاعری بھی کی۔ ان مجموعوں کے نام یہ ہیں۔

1۔ چار چپ چیزاں

2۔ رستہ دسن والے تارے

3۔ سفر دی رات

4۔ کل کلام

جب کہ دو انگریزی شاعری کے مجموعے بھی ان کے کریڈٹ پر ہیں۔

منیر نیازی نے نثری کام بھی کیا چند اردو، پنجابی ڈراموں کے ساتھ سفرنامے بھی لکھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کالم نگاری بھی کی۔

پنجابی ڈراموں میں

1۔ قصہ دو بھراواں دا

2۔ قصہ کلے آدمی دے سفر دا

اردو میں انہی پنجابی ڈراموں کا ترجمہ کیا گیا۔

1۔قصہ دو بھائیوں کا

2۔ایک اکیلے آدمی کا سفر

سفر نامہ:

منیر نیازی نے مشاعروں کے لئے جن ممالک کے سفر کییان کے مختصر احوال سفر ناموں کی صورت میں لکھا۔

1۔نیا گرا سے واپسی

2۔سفر نامہ

3۔ناروے کی سیر

4۔سفر نامہ چین

کالم نگاری:

منیر نیازی نے 1992ء میں چھ کے قریب کالم لکھے۔

1۔لوگوں نے مجھے ہائی جیکر سمجھ لیا

2۔پاکستانی شاعر نیویاک میں

3۔عیش کے شب وروز میں ایک نقص ہے کہ ختم ہو جاتے ہیں۔

4۔اس شہر کے طلسمات پہلی محبت کی یاد ہیں

5۔سفر نامہ اور دوسری باتیں

6۔جب ایک ادارہ نہیں رہتا۔

منیر نیازی بس اپنی ہی ہستی کا دم بھرتے نظر آتے ہے۔وہ کسی شاعر کو اپنے مقابل نہ سمجھتے تھے۔کلاسیک شعراء میں وہ صرف میرؔ، غالبؔ اور سراجؔ اورنگ آبادی کو ہی سراہتے اور قابل سمجھتے تھے۔اپنے دور کے شعراء کو وہ بس مناسب خیال کرتے یا چند ایک کو اچھا بھی کہ دیتے تھے۔ان کی خیال میں بڑا شاعر کوئی نہیں تھا۔کشور ناہید کو وہ اول درجہ کی شاعرہ جبکہ پروین شاکر کو بھی اچھی شاعرہ کہتے تھے۔منیرؔ نیازی اپنے آپ کو اُردو اور پنجابی کے اچھے شاعر ہونے کا تصور پیش کرتے انھوں نے شاعری کی اصناف نظم اور غزل میں بھی اپنے معیار کو بلند

کرنے کی کوشش جاری رکھی۔انھوں نے فلموں کے لئے گیت لکھے اوران کے مجموعوں میں نثری نظمیں بھی شامل ہے۔طارق عزیز نے ''ہم زاد داد کھ'' کی شاعری میں ان کا انداز بیاں اور صفات اپنانے کی کوشش کی مگرادب میں جو کام شعوری طور پراور منصوبے کے تحت کیا جائے وہ کم ہی کامیاب ہوتا ہے۔اس لیےان کے کلام میں وہ انوکھا پن اور بے ساختگی نہ آسکا جومنیر نیازی کی شعری کا خصوصیات خاصہ ہے۔

منیر نیازی کی شاعری میں دواطراف یعنی دو جہتیں پائی جاتی ہیں۔ایک معنویت کی اور دوسری فضا کی۔آج کے دور میں جب تنقید کرنے والے معنی اور معنویت پر زور دیتے ہوئے زبان والفاظ کے تعلق کو باریک بینی سے دیکھ رہے ہیں تو اس صورت میں منیر نیازی کی شاعری کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ان کی شاعری میں لفظ معنی سے زیادہ علامتوں کی شکل میں استعمال ہوئے جن کومنیر نے نشان کہا ہے۔منیر نیازی کی نظموں میں معنویت کے حوالے سے "سعادت سعید" نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

> ''منیر نیازی کی نظموں کا کشف ہماری تہذیب کے یک طرفہ رجحان سے پیدا ہوتا ہے ایک ایسا رجحان جو دھوپ کی طرح بے رنگ اور پیتل کی طرح بدنما ہے۔اس رجحان کے زیر اثر نمودار ہوتی ہوئی دنیا میں ہر طرف تنہائی اور دشمنی بے توجہی اور افسردگی دکھائی دیتی ہے۔شاعر اس بدنما دنیا کی تصویر پیش کرتے ہوئے قاری تک اس تصور کو پہنچانا چاہتا ہے کہ جسے اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں وہ تہذیب جس کی طرف یہ مختلف نظمیں رہنمائی کرتی ہیں ایک ایسے آشوب میں گرفتار ہےجہاں اس کو اپنی منزل کا علم بھی میسر نہیں ہے۔"(4)

منیر کی شاعری میں ایک ایسی دیو مالائی بصیرت کام کرتی دکھائی دیتی ہے جو اشیاء کے درمیان تناسب تعلقات کو برہم کر دیتی ہے اور عام موجود مادے اور منظروں سے ایک نئ کائنات تخلیق کرتی ہے۔منیر نیازی کی شاعری ہمارے عہد کا ایک ایسا منظر نامہ مرتب کرتی ہے

جس سے ہم اپنے عہد کے فرد اور سماج کی چلتی پھرتی شکلیں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ منیر نیازی کوئی سماجی فکر سیاسی کارکن یا نعرے باز فرد نہیں بلکہ وہ اول و آخر ایک تخلیق کار ہے جو تخلیق کی جمالیاتی قدروں کو فن میں اولیت دیتا ہے۔ اس لیے منیر نیازی کی شاعری کا مرکزی حوالہ جمالیاتی اور فنی حوالہ ہے اس کے ساتھ ساتھ منیر نیازی نے اپنی شاعری میں اپنی شخصیت کا اظہار کیا ہے۔ ان کی توانا تخلیقی شخصیت کی جھلک ہمیں ان کی شاعری میں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

منیر نیازی کے فن پر زیر نظر کتاب کی حیثیت سے خشت اول کی ہے۔ ہمارے ہاں تخلیق کاروں کی زندگی اور ان کے فن پر کتابیں تحریر کرنے کا زیادہ رواج نہیں اور بہت کم لکھنے والے ایسے ہیں جن کی زندگی میں ان پر پوری کتاب تحریر کی گئی ہو۔ یہ کتاب منیر نیازی کے فن کا اجمالی جائزہ ہے۔ منیر نیازی کی شاعری کے بہت سے پہلو ہیں ان میں سے صرف چند ایک کو مختصر طور پر چھونے کی کوشش کی جائے گی۔ منیر نیازی کی نظموں اور شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے سہیل احمد خان لکھتے ہے:

> "منیر اپنی بعض تازہ نظموں میں چاند سے سورج کی طرف سفر کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے اور ان نظموں میں سورج اور اس کی چمک کے تلازمات ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس کائناتی سفر سے میرا دھیان بار بار حضرت ابراہیمؑ کے قصے کی طرف منتقل ہو رہا ہے خصوصاً اس لیے بھی کہ اس مجموعے کا آغاز حمدیہ نظموں سے ہو رہا ہے کائنات کا پھیلاؤ مظاہر سے آگے کسی عظیم تر حقیقت کے ادراک کے مرحلے سے بھی دوچار کرتا ہے۔ یوں بھی اب منیر کی شاعری پر قرآن حکیم کے مطالعے کے اثرات واضح طور پر سامنے آنے لگے ہیں۔ میں نے منیر نیازی کی اس تازہ کتاب کے محض ایک رخ کا ذکر کیا ہے۔ منیر نیازی کے لہجے میں اب جو تفکر اور ارتکاز پیدا ہوا ہے وہ بھی

دیکھنے کی چیز ہے۔اسی طرح ان نظموں اور غزلوں میں اپنے
عہد کی زندگی اور رویوں کا جو شعور ہے اس کا ذکر بھی ضروری
ہے۔منیر نیازی کا یہ مجموعہ اس کے فن کی نئی سمتوں اور ان نئی
سمتوں سے آگے امکانی دنیاؤں کی خبر دیتا ہے‘‘۔(5)

منیر نیازی کا شماران شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی ذات اور پہچان کو اس فضا سے جوڑ دیا جو ان کی شاعری سے خود بخود مرتب ہوتی چلی گئی۔اس فضا میں پر اسراریت بھی ہے اور ملگجی روشنی بھی جو پر اسراریت کو علامت اور استعارے کے ذریعہ کھولتی ہے اور قائین میں اک انوکھی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔انھوں نے سیدھیسا دھے، سچّے اور کھرے جذبات، حسّی تجربات اور ماضی کے خوشگوار خوابوں اور یادوں کی شاعری کی ہے۔ان ہی میں سے بعض جذبات اور احساسات جو عام طور پر اردو ادب اور خاص طور پر اردو شاعری کو منیر نیازی کی مرہون منت مانا جاتا ہے۔بعض ناقدین بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کو منؔیر کا دور کہتے ہے۔جس میں وہ پنجابی اور اردو گیت نگاری، غزل اور نظم فلمی اور غیر فلمی شاعری کے آسمان پر روشن خورشید بن کر چمکتے نظر آتے ہے۔وہ صرف نام کے ہی نہیں بلکہ فن و ادب کے بھی منؔیر مانے جاتے ہیں۔

پرسی بائیس شیلے: سوانح وتخلیقات

پرسی بائیس شیلے انگریزی رومانی شاعری کے ایک مشہور و معروف شاعر تھے۔ انگریزی ادب میں انھوں نے نغمہ نگاری میں خوب نام کمایا۔ان کی تخلیق میں معاصر سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقائق واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ شیلے اپنی زندگی میں تو مشہور نہیں ہو سکے مگر بعد از مرگ ان کے کام کو بہت شہرت ملی۔ شیلے ایک ذہین اور تخلیقی صلاحیت شخصیت کا مالک تھا۔وہ شروع سے ہی باغی طبیعت کے مالک اور ذہنی فرار کے لئے بچپن میں اپنی بہنیوں کو باغوں، جنگلوں، ویرانوں کی کہانیاں سنا کر خوش ہوتا اور اس طرح وہ ذہنی سکون حاصل کرتا۔ اس نے انگریزی ادب کو بہتر شاعری دی۔ان کی شاعری آج بھی دنیا بھر کے تعلیمی اداروں

کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہے۔ان کا کلام فلسفیانہ ادراک،فطری مشاہدے اورفکری شعور کی خوبیوں کے ساتھ ملتا ہے۔انھوں نے اسلوبی سطح پر تخیل اور فکر وفن کو اپنی شاعری میں ڈھالا۔ انھوں نے اپنے نازک خیال اور خوبصورت انداز سے انگریزی ادب کے دامن کو وسیع کرنے میں کردار ادا کیا۔بحثیت شاعران کے یہاں انفرادی شعور بیدار ہوتا محسوس ہوتا ہے۔اور یہ ہی تخلیقی شخصیت کی پختگی کا عہد ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی صلاحیت، جرات اور ہمت کے ذریعے ہر لمحہ آگے بڑھنے کی سعی کی ہے۔انگریزی ادب میں وہ رومانی شاعر کے طور پر جانے جاتے ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے عام انسان کی زندگی، ان کے مسائل اور معاشرے کی اصلاح کے لئے کام کرنے کی کوشش کی۔ شیلے نے اپنے اردگرد کے ماحول اور لوگوں کے رویوں کا تجزیہ کرتے ہوئے شاعری میں حقیقت بیانی سے کام لیا۔ شیلے نے تخیلی فرار کے لئے شاعری شروع کی اور پھر ساری عمر شاعری ہی کی۔ پرسی بائیس شیلے 4 اگست 1792ء فیلڈ پیلس، نزد ہورشام، انگلینڈ میں پیدا ہوا۔ وہ انگریزی رومانی شاعر جس نے محبت اور سماجی انصاف کو تلاش کرتے ہوئے نظم نگاری میں سنجیدہ تبدیلیوں کا موجد بنا جو بعد میں انگریزی زبان میں کمال درجہ ثابت ہوئی۔ شیلے اپنے دادا بائیشے کا وارث تھا۔ٹموتھی شیلے،اس کا باپ ایک کمزور روایتی مرد تھا، جو ایک دبنگ باپ اور ایک باغی بیٹے کے درمیان پھنس گیا تھا۔

شیلے نے ساؤن ہاؤس اکیڈمی میں (1802 سے 1804) اور ایٹن سے (1804 سے 1810) تک تعلیم حاصل کی وہی سے اس نے تخیلاتی فرار حاصل کرنے کے لئے ادبی ذوق میں دل چسپی لینا شروع کی۔سترہ سال کی عمر میں اپنے تحریری کیریئر کی ابتدا کی اور اپنی پوری زندگی شیلے نے زیادہ سے زیادہ انسانی جذبات اور ان کے ادراک کو زندگی کی حقیقتوں سے جوڑنے کی سعی کی ہے۔اپنے بہترین دوست جارج گورڈن اور لارڈ بائرن کی ممکنہ رعایت سے اس نے اپنی زندگی اور مختلف کاموں کی اپنی ایک تاریخ بنائی۔

وہ اسکول کے زمانے سے ہی سخت اور غلط اصولوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے رہے۔اپنی ابتدائی بصیرت والی نظم" کوئین میب "میں اس نے دعویٰ کیا کہ "بادشاہ، پجاری، مذہب اور تجارت نقصان دہ ہیں اور انہیں فنا ہونا چاہیے۔"اور فیری کی ملکہ نے یہ پیشین گوئی کی

کہ " عورتیں آزاد ہوں گی ، محبت نرم اور سچی ہو گی"۔ پُر امید اور معاشرے میں بھلائی کے واسطے لڑنے والے شیلے کے یہ الفاظ زبان زد عام ہے۔" اگر سردیاں آگیئں ہیں تو پھر بہار کیسے پیچھے رہ سکتی ہے "اسکائی لارک میں لکھا ہے:

" پھیلے ہوئے یہ شام کے ہلکے سے دھند لکے
دامن میں چھپا لیتے ہیں پروازِ حسیں کو
ہو جاتی ہے گم ایسے تو انسان کی نظر سے
جیسے کہ ستارے نظر آتے نہیں دن میں (6)

انگریزی ادب میں خوشی اور غم دونوں انتہاؤں میں پرسی بائیس شیلے کی زندگی کی مثال دی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کے اہم موضوعات میں حوصلہ افزائی اور بے چینی، اختیارات کے خلاف بغاوت، گہری بصیرت کے تصور اور اعلیٰ شاعری کی طاقت، سچائی کی جستجو اور ابدی آزادی کی تلاش کا جذبہ یہ سب اس نے اپنی زندگی کی حقیقتوں سے پیش کیا۔

شیلے کی شخصیت کے بارے میں دیکھے تو وہ بہت خوبصورت موہنی آنکھوں اور گھنگھریالے بالوں والا نوجوان تھا۔ شیلے کو انوکھی اور من گھڑت کہانیاں جس میں بھوت پریت ہو، بہت پسند تھی:

" بچپن ہی سے اس کی رگ رگ میں رومانیت کا خون موجزن تھا۔ شیلے کے نازک اور خوبصورت ہاتھ، برف جیسا سفید بدن، موہنے والی آنکھیں، اور سر پر گھنگھریالے بال حسن و جمال کو آئینہ دکھاتے تھے۔ اکثر بہنوں کو خوش کرنے کے لئے من گھڑت بھوت پریت والی داستان سُنانا اس کا مرغوب مشغلہ تھا۔ کبھی کبھی وہ رقیق چیزوں سے آگ کے شعلوں کا تماشا دکھایا کرتا تھا۔"(7)

اپنے ابتدائی سالوں میں شیلے کا خیال تھا کہ چرچ اور حکومت کے اداروں اور طبقاتی بنیادوں پر چلنے والے سماجی ڈھانچے سے انسانیت خراب ہوگئی ہے۔ بعدازاں اس کا خیال تھا

کہ ادارے انسانی فطرت کا نمو ہے، معاشرے میں تبدیلی سے پہلے اس کی اصلاح افراد کے دلوں میں ہونی چاہیے اور انفرادی تبدیلی جس کی شیلے نے بہت وکالت کی وہ عالمگیر محبت کا نظریہ تھا۔ان کی شاعری انقلاب پر مبنی خیالات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہے جس پر اس نے فکری وفنی اور شعر وسخن کی بنیاد قائم کی۔ شیلے اپنے اردگرد کے نظام کو بدلنا چاہتا تھا۔اس کا مقصد معاشرے میں اصلاحی نظام لانا تھا۔ایسا نظام جس میں عام انسان کو سہولت مل سکے۔ وہ فطرت اور قدرت کے نظام کو واپس لانا چاہتا تھا:

ندی دریا سے مل کر ہم آغوش ہوتی ہے
اور دریا گھل ملتے ہیں سمندر سے
ہوائیں آسمانوں کی ہمہ وقت ساتھ اُڑتی ہیں
یہ کیسا دلفریب احساس ہے جاناں
کہ اس دنیا میں کوئی بھی اکیلا نفس نہیں رہتا
خدائے ذوالجلال کی حکمت کی برکت سے
ہر اک روح دوسری روح میں صدا مدہوش رہتی ہے
تو پھر میں کیوں رہوں محروم
تمہاری دید سے جاناں؟(8)

شیلے کے دوست ہاگ کا لہنا ہے کہ شیلے کو تعلیم سے خاص لگاؤ تھا۔اس کے ہاتھ میں ہر وقت کتاب ہوتی اور وہ علم کے حصول کے لیے ہمہ تن گوش رہتا۔ اس کا آکسفورڈ میں گزرا وقت اس کے لئے تمام عمر ایک خوبصورت یادگار کی حثییت رکھتا تھا مگر زندگی کا یہ لمحہ تب مشکل میں گرفتار ہوا جب 1811ء میں شیلے نے مذہب پر بات کی اور عیسائیت کو خدا پر ترجیحی دی۔صرف یہ ہی نہیں اس نے اس بات کا اشتہار تمام یونی ورسٹی کے وائس چانسلر، مذہبی پیشواؤں اور کالج کے سربراہوں کو بھیجا۔جب معاملہ بگڑا تو ہاگ نے اس سارے معاملے کی ذمے داری اپنے سر لے لی اور دونوں ہی کو یونی ورسٹی سے نکال دیا گیا۔

شیلے کی پہلی شادی ہیریئیٹ سے ہوئی۔ شیلے نے ہیریئیٹ کو اپنے غیر روایتی مذہب

اور سیاسی عقائد کو اپنانے کے ترغیب دینے اور پھر شادی کے ذریعے اسکول کے ساتھ اور اساتذہ کے ظلم وستم سے بچانے کی کوشش میں کی۔تین سال بعد شیلے کو میری گوڈون سے محبت ہوگئی، جو ہیریئیٹ سے زیادہ پُرکشش تھی۔میری سے شادی کے بعد شیلے نے ہیریئیٹ کو میری کے ساتھ بہنوں کی طرح رہنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی،مگر ناکام رہا۔ ہیریئیٹ نے اس سارے معاملے سے تنگ آکر خودکشی کر لی۔اس طرح شیلے نے اپنے اور ہیریئیٹ کے دو بچوں کی قانونی تحویل کھودی۔

شیلے کی زندگی تمام عمر غم اور خوشی کے سمندر میں ڈوبتی اور ابھرتی رہی۔زمانے کی نگاہ میں حقیر اور عدالت کی نگاہ میں مجرم کہلایا۔اس نے تمام عمر فرار کے بہت حربے اختیار کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور حقیقت کا ہر حال میں سامنا کرنا پڑتا رہا۔مارچ 1818ء میں بیماری کی وجہ سے اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ انگلینڈ کی بجائے اٹلی میں رہے گا۔اس نے اپنے بچوں مس کلیت مانٹ، ولیم اور کلیرا، جو 1817ء میں پیدا ہوئی، کے ہمراہ موسم سرما کے خوبصورت دن گزارے اور لندن کو آخری بار جی بھر کر دیکھا۔یہاں شیلے پژمردگی اور اداسی کا بری طرح شکار ہو گیا تھا۔

مارچ 1818ء میں شیلے کی بڑی بیٹی کا انتقال ہو گیا اور 1819ء میں بیٹے کی موت نے شیلے کے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔جبکہ 1819ء میں تیسرے بیٹے کی ولادت نے شیلے کی زندگی میں دوبارہ رنگ بھرنے کی کوشش کی۔اسی دوران 1819ء سے 1822ء تک شیلے نے انگریزی ادب کو بہترین تخلیقات سے نوازا۔یکم جولائی 1822ء کو شیلے کشتی کے ذریعے پیسا گئے، وہاں وہ بائرن کے ساتھ ٹھہرے اور پھر واپسی کے کئے کشتی پر سوار ہو گئے۔سمندر میں کشتی شدید طوفان کی نظر ہوگئی۔ڈوبنے کے پندرہ دن بعد اس کا جسم سمندر کنارے پایا گیا۔احمد عقیل روبی اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہے:

"شیلے کی موت کے بعد مختلف قیاس آرائیاں کی گئیں۔کسی نے
کہا شیلے ان دنوں بہت نا اُمید تھا اور مرنا چاہتا تھا۔کسی نے کہا
اس کشتی کو بائرن کی کشتی سمجھ کر بحری قزاقوں نے لوٹنے کی غرض

سے حملہ کیا۔ کسی نے اس کی موت کو سیاسی قتل قرار دیا۔ کیونکہ
اس پر پہلے ایک حملہ ہو چکا تھا۔ بہر حال اس کی موت کے ایک
دن بعد اخبار میں جلی حروف میں اس کی موت کی خبر چھپی۔
شیلے۔ شاعر سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔ اب اسے پتا چل گیا ہوگا
کہ خدا ہے کہ نہیں۔"(9)

جولائی 1822ء کو لیوونو، ٹسکنی (اٹلی) کے سمندر میں انتقال ہوا۔ اس کے جسدِ خاکی کو ٹرے لانی، ہنٹ اور بائرن کے سامنے نذرِ آتش کیا گیا۔ اور اس کی خاک کو پروٹسٹنٹ کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ اس کے قبر پر شیکسپیئر کے تین مصرے درج ہیں۔ ترجمہ:

'اس کی تخلیق کے پھولوں میں وہ شادابی ہے
جو فسردہ نہیں ہو سکے زمانے میں کبھی
زندگی جب بھی مصیبت سے گلے ملی ہے
کچھ نئے تجربوں اور فکرِ کی دولت لے کر
ذوقِ احساس کو رنگین بنا دیتی ہے"(10)

شیلے کے یہاں روایتی اور ثقافتی مخالفت اور اس کی پاسداری ایک ساتھ پائی جاتی ہے۔ ناقدین کہتے ہیں کہ شیلے باغی ہے، اور روایات سے باغی ہونے کا الزام ہے۔ مگر وہ تجربوں کی سچائی کا بے باکی اور جذبوں کے حوالے سے ایسا اظہار کرتا ہے کہ فرسودہ خیالات ڈگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں انھوں نے معاشرے غلط روایات اور جبر و استحصال کے خلاف آواز اُٹھا کر ان مسائل پر بات کی ہے۔ اس نے سماجی زندگی میں انسانی حقوق اور آزادی کے بارے میں ہوش مندی اور بے باکی سے احتجاج کیا۔ اس نے سچی اور کھری صفات کے ساتھ شعوری اور لاشعوری طور پر معاشرے کی ترقی اور فلاح لے لیے کوششیں کی ہے۔ ان کی شاعری میں متاثر کن تخیل ہے۔ و؟ جب محبت کے موضوع پر بات کرتے ہیں تو ان کی شاعری میں فن کی لطافتوں، خیال کی رعنائیوں اور بیان کی سادگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اظہار خیال کے لیے مناسب الفاظ اور آسان اسلوب بیان کا استعمال با آسانی ملتا ہے۔ ان کی

شاعری میں انسانی تناظر، یادوں، عصر حاضر کے سماجی ونفسیاتی مسائل اور حقیقت نگاری کے جا بجا عنصر ملتے ہیں۔

ان کے یہاں انسان خواہشات میں ایسیسفر کا حصہ ہے جو آگے کو جا رہا ہے اور واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ معاشرے کی اصلاح کے لیے کوشاں تھے۔ ان کی شاعری کے الفاظ، مصرعے اور اشعار پڑھنے اور سننے والوں کو دیر تک یاد رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہمہ جہت حقیقتوں سے کام لیتے ہوئے تقریباً زندگی کے پہلوؤں پر قلم اُٹھانے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے انسانیت کے وقار اور سر بلندی کو اپنی شاعری میں اولین ترجیح دی اور عدل و انصاف کی آرزومند رہے۔ ان کی شاعری میں معاشرے کے منفی رجحانات کو مخاطب کیا گیا ہے۔ وہ اپنے دائرِ یاسلوب میں حیرت انگیز اور پختہ رہے۔ وہ اپنی شاعری کے انتخاب میں سنجیدہ نظر آتے ہے۔ ان کے کلام میں فکری وفنی نقطہ نظر سے کئی رموز پوشیدہ ہیں۔ شیلے نے قلم کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور اپنے اردگرد کی سیاسی ومعاشی صورت حال پر بے دھڑک لکھا۔

انھوں نے اپنے اردگرد کے گھٹن زدہ ماحول کو محسوس کیا اور اس کے خلاف جب لکھا تو ایک احتجاج کی آواز بلند ہوئی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ معاشرے میں گھٹن اور دباؤ بھگاڑ اور خرابی کا سبب بنتا ہے۔ ان کے خیال میں رومانوی طرز احساس فکری ارتقاء کی پہلی سیڑھی ہے۔ انیسویں صدی میں شیلے کو ناقدین نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ جبکہ وکٹورین دور میں ان کو مثالی محبت کا شاعر مانتے ہوئے رومانوی شاعر کہا جانے لگا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پھر ایک دفعہ ان کی شاعری بے توجہی کا شکار ہوئی جبکہ تیس کی دہائی میں دوبارہ ان کی فکری وفنی منظر کشی، گہری فلسفیانہ سوچ اور جذباتی پختگی نے تنقید کے میدان میں اپنی جگہ بنائی۔ بورا نے ان کو شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے اعلیٰ درجے کے فلسفی شعراء میں شمار کیا۔ کچھ ناقدین ان کو منطق دان کہتے ہیں۔ اپنی بصیرت اور روایتی معاملات سے اپنا پیغام رسائی میں ہر رکاوٹ کو عبور کیا۔ انگریزی شاعری میں تخلیقی جذبات کے ساتھ روایتی اور ادبی لحاظ سے ایک نئی راہ اور نئے اسلوب سے آگاہ کرنے کی سعی ملتی ہے۔ اسلوب بیان اور نظریات کے حوالے سے ان کی ایک تخلیقی واردات کارفرما ہے۔ شعری لطافتوں اور اظہار و بیان کی خصوصیات کے حوالے سے

ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے اپنے دائرے ہے۔یونان کے المیہ نگار "اسکائی لیس" کو ڈرامے کی جدید شکل مانتے ہے۔اس ڈرامے میں شیلے نے اپنے نظریات کو پیش کرتے ہوئے ظلم، جبر اور آمریت کے خلاف آواز اُٹھانے اور جدوجہد کرنے کا استعارہ دیا۔شیلے اسی جذبے کے تحت انسان کو خوشگوار زندگی کی تجویز پیش کرتے ہوئے اپنے حقوق اور آزادی کے بارے میں اکساتا ہے۔وہ پرندوں کو بھی پنجروں میں رکھنے کے سخت خلاف تھا۔اس کے خیال میں غلامی سب برائیوں کی جڑ ہے۔

شیلے شاعری میں اصول پرستی، مثالیت اور تصوریت کا حامی تھا۔اس کیلئے شاعری اخلاقی قدروں، اوج کمال اور نقطہ عروج تھی۔وہ جرت مندی اور بلند نظری کا قائل تھا۔اس کی شخصیت دیکھی تو وہ خوش باش، زندہ دل اور مستقبل مزاج رکھتا ہے مگر کئی نقادوں کے قبول خبطی، تنگ دل، کاہل اور آرام طلب جانا جاتا تھا۔یہ سچ ہے کہ اس کا شوق صرف شاعری پڑھنا لکھنا تھا۔اس نے انگریزی ادب کو بہترین شاعری دی جو آج بھی دنیا بھر کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہے جن کے بغیر انگریزی ادب مکمل نہیں ہوتا۔یہ فلسفیانہ ادراک، ذہانت، شعور کے اظہار، فطری مشاہدے، کلاسیکی رومانویت، سادہ لوگوں کی زندگی معنی خیز شاعری زندگی کی حقیقتوں کی ہمہ گیر شاعرانہ کارنمایاں پر مبنی ہیں۔وہ الفاظ سے تصویریں اور تصور پیش کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ان کی شاعری پڑھتے ہوئے قارئین ایک ایسی وادی میں کھو جاتے ہیں جہاں دردمندی اور برابر حقوق ہو اور انسانوں کے انسانیت کے درجے پت لے جائے۔

شیلے کی مشہور کتب اور ادبی کام

شاعری اور ڈرامہ:

وکٹر اور زائر کی اصل شاعری

مارگریٹ نکلسن کے مرنے کے بعد کے ٹکڑے

بادشاہ کی زندگی میں

دی سینٹ اروائن

دی ڈیولز واک: اے بیلڈ

کوئین میب

الاسٹر، یا خلوت کی روح

موت پر

مونٹ بلاک

اسلام کی بغاوت

اوزیمینڈ یاس

روزالینڈ او ہیلن

دی سنسی

اوڈ ٹو دی ویسٹ ونڈ

انارکی کا ماسک

جولین اور میڈ الو (آٹو بائیوگرافیکل نظم)

اسکائی لارک

بادل

اڈونئس (جان کیٹس کی موت پر مرثیہ)

زندگی کی فتح

نثری کام

پراسرار ڈاکو کا غار

وولفسٹین

شاعری کا دفاع

اصلاحات کا ایک فلسفیانہ نظریہ

قاتل، ایک رومانس کا ٹکڑا

دی کولیزیم،ایک ٹکڑا

ایلیسیئن فیلڈز:ایک لوسیانک فریگمنٹ

اونا فا وولا (افسانہ)

مضامیں الحادکی ضرورت

حقوق کا اعلان (آئرش لوگوں سے خطاب)

مابعدالطبیعات پر قیاس آرائیاں

سبزیوں کے نظام

مستقبل کی ریاست

محبت

ایتھنز کے ادب،فنون اور آداب

تراجم

مڈاس

پروسر پائن

چھ ہفتوں کے دورے کی تاریخ

افلاطون کا آئین

افلاطون کی ضیافت

کسی بھی ادیب کی قلم سے عظیم ادب گہری بصیرت پیدا ہونے کے بعد تخلیق ہوتا ہے۔ شیلے نے انسان کے حقوق کے لئے جدوجہد کی۔اس نے محسوس کیا کہ انسان کے احساسات کا اظہار کرنا کتنا ضروری ہے۔اس کے خیال میں انسانی فطرت میں جو بنیادی تبدیلیاں آنی چاہیے وہ شاعری میں تخیل کی وسعتوں کی تبدیل کرنے کے ذریعے افراد کو مخاطب کرنے سے ہی ممکن ہوسکتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ عام انسان عظیم بصیرت کی سچائیوں کا تجربہ کرسکے۔سماجی تبدیلی تب ہی ممکن ہوتی ہے جب اس کو بہتر کرنے کی کوشش کی جائے:

" شیلے پیدائشی طور پر ایسے کردار کا مالک رہا ہے جس نے اس

کو مجہد ،فرشتہ صفت اور نظریاتی انسان بنادیا تھا۔وہ طالب علمی
کے زمانے سے ہی امن اور آزادی کو پسند کرتا تھا۔اس کی
روح کسی بے جا ظلم اور زیادتی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔
وہ ایک تسلیم شدہ باغی تھا جس نے مذہبی فریب،اخلاقی پستی،
اور رسم و رواج سے ملوث اداروں کے خلاف علمِ بغاوت بلند
کیا۔"(11)

یورپ میں اٹھارویں صدی میں سیاسی آزادی،قدرتی عروج اور بلند خیالات کے ردعمل کے نتیجے میں رومانی دور شروع ہوا۔1800-1860 تک رومانیت کی ادبی تحریک چھائی رہی۔شیلے انگریزی ادب میں 19 صدی کا مقبول ترین شاعر تھا جس نے اتنی کم عمری میں ہی ادب میں اپنا مقام بنایا کیونکہ وہ کم عمری میں دنیا چھوڑ گیا۔وہ شروع میں بہت سے شعرا کے زیر اثر رہا،وہ غور وفکر کرنے ،گہرئی سیمطالعہ کرنے ،سوچ بچار اور تحصیل علم میں سنجیدہ تھا، شیلیا یک شاعرانہ احساس، کیفیات، ادراک، اور ہیجان انگیز جذبات کا ماہر تھا۔تصور کی سچائی پر یقین رکھتا تھا۔علم روح انسانی جانتا اور بے مثال مفکر تھا۔

اس نے انگریزی ادب کو بہترین شاعری دی۔آج بھی دنیا کے بڑے تعلیمی اداروں کے نصاب میں ان کی شاعری پڑھائی جاتی ہے۔انھوں نے انگریزی ادب میں فلسفیانہ سوچ ذہانت،شعور کی گہرائی، مشاہدے اور رومانویت کے احساس کو دکھایا۔

انگریزی ادب مکمل نہیں ہوتا۔اس کے خیال میں یہ سادہ لوگوں کی زندگی معنی خیز حقیقتوں کی ہمہ گیر شاعرانہ کارنمایاں پر مبنی ہے۔شیلے نے اپنی آخری کتاب کی اشاعت کا کام خود کیا۔تقریبا150 کاپیاں نکلوائیں اور 50 کاپیاں بتائے بغیر اپنے جاننے والوں میں تقسیم کی جبکہ 70 کاپیاں پریس میں ہی رکھوادیا وران کو تقسیم سے روک دیا۔

1821 میں شیلے کی وفات سے ایک سال پہلے اس کا دوست ولیم کلارک اس کتاب کو مارکیٹ میں لے آیا۔بقول ایک نقاد کے لوگ اس کتاب پر پاگلوں کی طرح جھپٹ پڑے۔شیلے کبھی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کتاب یا شیلے کے خیالات کی وجہ سے لندن کے

لوگوں میں نفرت پھیلے۔ شیلے نے ولیم کلارک کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔جس کے نتیجے میں ولیم کو جیل ہوگئی۔اور کتاب کو حکومت نے ضبط کرلیا۔1830 میں شیلے کی وفات کے بعد اس کتاب کے بارہ ایڈیشن چھپے۔اور اس کو بہت مقبولیت ملی۔آج اس کے خیالات کو پوری دنیا میں پذیرائی حاصل ہے۔اس کے ڈرامے کو ادب کی اہم ترین تخلیق قرار دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔رحیم گل خدوخال، ماہنامہ فاصلہ، پشاور، مئی 1987ء

۲۔حسن رضوی، گفت وشنید، (انٹرویو)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1990 ص:109

۳۔منیر نیازی، سفید دن کی ہوااور سیاہ شب کا سمندر، (دیباچہ) خزینہ علم وادب، لاہور، ص:7

۴۔سعادت سعید، بے خوابی کے خوابوں کا شاعر۔منیر نیازی معاصر ص:503

۵۔منیر نیازی، ماہ منیر، (کھلے منظروں کی دنیا)، خزینہ علم وادب، بازار لاہور، 1991ء، ص:9

۶۔ Percy Shelley, Byshe, Selected Poems, Kitab Mahal, Lahore,1980p257

۷۔شبنم گورکھپوری، بادِمغرب، شبنم گورکھپوری، گورکھپور (انڈیا)، 1990، ص:14

۸۔(نظم) فلسفہء محبت، ترجمہ نگار۔ نادیہ افتخار حسین،

۹۔روزنامہ دنیا۔اسپیشل فیچر۔احمد عقیل روبی، 15 مارچ 2016

۱۰۔PercyShelley,Byshe,Selected,Poems,p4

۱۱۔شبنم گورکھپوری، بادِمغرب، محولہ بالا، ص۔33

☆☆☆☆☆☆☆

منیر نیازی کی شاعری

(فکری و فنی مطالعہ)

نثر کے مقابلے میں شاعری کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔شاعری نے ہر دور میں قارئین کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے لیکن ایسا کم ہی ہوا ہے کہ کوئی شاعر یا ادیب ناقدین کی توجہ حاصل کرنے کے ساتھ عام لوگوں میں بھی برابر مقبول ہوا ہو۔اردو ادب میں بھی چند ایسے مشہور و معروف لوگ ہیں جنھوں نیا پنے اپنے دور میں ناقدین کے ساتھ عام لوگوں کی توجہ بھی حاصل کی۔منیر نیازی کا شمار بھی انہی شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے اپنے دور میں شہرت حاصل کی۔انھوں نے شاعری کے ساتھ گیت اور کالم نگاری بھی کی۔انھوں نے شاعری میں ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو عام اور ذہین دونوں طرح کے قاری کی سمجھ میں آسکے اور وہ اس سے بھرپور فائدہ بھی اُٹھا سکیں۔ان کی شاعری ان کے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار ہے۔ان کی نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے موضوعات پر پختگی حاصل ہے۔انھوں نے جنگل، چڑیل، تنہائی، سانپ اور چیل جیسے استعارے، علامتی اسلوب اور شاعرانہ الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے موجودہ دور کے انسان کی داخلی و خارجی کرب کا اظہار کیا ہے۔منیر نیازی کے کلام کی گہرائی کو سمجھنے اور ان کے موضوعات پر گرفت حاصل کرنے کے لیے ان کی ذات کی داخلی و خارجی حقیقتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ان کی شاعری کے الفاظ، مصرعے اور اشعار پڑھنے اور سننے والوں کو دیر تک یاد رہتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے تقریباً زندگی کے پہلوؤں پر قلم اُٹھانے کی سعی کی ہے۔وہ اپنی شاعری کے انتخاب میں سنجیدہ رہے۔

ان کے بارے میں اکثر لوگ شکایتی انداز میں کہتے ہیں، کہ منیر نیازی اپنے علاوہ کم ہی کسی کو شاعر مانتے تھے اور کسی کو داد دینے کے معاملے میں بھی کنجوسی کا مظاہرہ کرتے تھے۔یہ نقطہ نظر بھی پیش کیا جاتا ہے کہ وہ خود پرستی کا شکار تھے۔جو اپنے سوا کسی اور کو شاعر نہیں مانتے

تھے۔ یہ ساری باتیں درست ہوسکتی ہیں مگر یہ بات عجیب ہے کہ وہ لوگ جن کی وہ تعریف نہیں کرتے تھے یا وہ لوگ جن کو ان سے شکایت تھی جب وہ ان کے کلام کو سنتے تو بے اختیار داد دینے اور تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ ان کو زیادہ تر غزل کا شاعر مانا جاتا ہے۔ ان کا لب و لہجہ ان کو اپنے ہم عصر شعراء سے الگ اور نمایاں کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کی شخصیت کی جھلک واضح ہے۔ انھوں نے آخری دم تک شاعری کی۔ ان کے کلام میں فکری وفنی نقطہ نظر سے کئی رموز پوشیدہ ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بہت سے موضوعات اور تجربات پر قلم اُٹھایا۔ وہ کسی بھی موضوع پر لکھنے کے لیے بڑے بڑے الفاظ کی بجائے عام اور سادہ الفاظ کا انتخاب کرتے۔ انھوں نے شاعری میں سیاست سے لے کر اخلاقیات اور اخلاقیات سے لے کر انسانی حقوق جیسے موضوعات پر بے باکی سے لکھا۔ وہ اپنی بات سمجھانے کے لئے مشکل راستہ نہیں اپنایا بلکہ وہ بڑی سے بڑی بات کے لئے ایسا انداز اپناتے جیسے کوئی عام سی بات ہو۔ ان کا کلام کسی کے لئے اجنبی نہیں وہ ایسی باتیں اور واقعات لکھتے کہ قارئین کو اپنے خیالات اور واقعات محسوس ہوتے۔ ان کا انداز ایسا ہوتا جیسے کوئی دستک دے کر دل کے سب حالات و واقعات سے واقف ہو جائے:

> "اس کے بعد منیر نے غزلیں کہیں، نظمیں لکھیں، قطعے کہے اور گیت لکھے، اور پڑھنے والوں نے یہ محسوس کیا کہ ایسی جانی پہچانی باتیں کرنے والا، اجنبی نہیں ہوا کرتا۔ یہ دستک جو کسی نے پہلی مرتبہ ہمارے دل کے دروازے پر دی ہیبڑی خود اعتمادی کی حامل ہے۔ واویلا کرنے اور پکار لے کر زنجیر کھینچنے والا یوں متیقن نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنی آہ و بکا سے دل کے کمسن جذبات کو نالہ و شیون میں مبتلا کر کے چلا جاتا ہے جو اپنی سسکیوں کی تھپکیوں تلے ہمک ہمک کے سو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ہلکی سی دستک کس کی ہے؟ یہ ہلکی دستک منیر نیازی کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ہے۔"(1)

منیر نیازی کے ہاں بہت سے موضوعات ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ارد گرد حالات وواقعات اور اپنی قلبی صورت حال کو بیان کرنے کے لیے بڑی بے باکی سے قلم اُٹھایا۔ وہ نرم الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے محبت، سیاست، معاشرت، آزادی اور تنہائی جیسے موضوعات پر لکھتے نظر آتے۔ آزادی اور پُرسکون فضا کا سوچتے ہوئے انھوں نے برصغیر کی تقسیم پر پاکستان کا انتخاب کیا۔ مگر خیالات اور حقیقت کے تناظر میں عملی طور پر حالات کچھ اور نکلے۔ عملی طور پر پاکستان بننے کے بعد پیدا ہونے والے حالات و واقعات نے بہت سی زندگیوں کو متاثر کیا۔ خاص طور پر وہ لوگ جو بھارت میں اپنا سب مال اسباب چھوڑ کر، بہت سی قربانیوں کے بعد اس امید پر ہجرت کر کے پاکستان آئے کہ یہاں وہ لوگ امن اور سکون کی زندگی گزار سکے گے مگر یہاں ان کو بڑی نا اُمیدی ہوئی۔ خود غرض لوگوں نے اپنے فائدے کے لیے حق دار لوگوں کی حق تلفی کی۔ انھوں نے بھارت سے بہت سی اُمیدوں اور پُرسکون زندگی کی خواہش میں ہجرت کی۔ ایک تصور جو سب مہاجرین کے ذہنوں میں تھا کہ پاکستان میں اسلام کی بالا دستی ہوگی۔ ایسی سرزمین جہاں سب کی مال، جان اور عزت کی حفاظت ہوگی۔ مگر ان کو ایسی کوئی عملی شکل نظر نہ آئی۔ منیر نیازی کا شمار بھی ہجرت کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے منیر نیازی نے قلم کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور اپنے ارد گرد کی سیاسی و معاشی صورت حال پر بے دھڑک لکھا۔ انھوں نے اپنے ارد گرد کے گھٹن زدہ ماحول کو محسوس کیا اور اس کے خلاف جب لکھا تو ایک احتجاج کی آواز بلند ہوئی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ معاشرے میں تشدد اور دباؤ خرابی کا سبب بنتا ہے اور ایسے وطن کے لیے کوشش ہرگز نہیں کی گئی تھی۔ وہ پاکستان میں آنے والے مہاجرین کو یثرب کے مہاجرین سے جوڑتے ہے:

> " منیر نیازی کو آزادی پسند ہے جہاں ماحول میں گھٹن ہو وہاں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اسے زیادہ پابند رکھنے کی کوشش کی جائے تو اس پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے اگر زندگی کے حسن سے پیار نہ ہو تو شاید وہ گھٹے ہوئے ماحول سے تنگ آکر خودکشی کرلے۔"(2)

منیر نیازی نے اپنے قلم کو بہت سوں کے حق کے لئے اُٹھایا۔ تقسیم کے بعد ملنے والی آزادی کے گھٹن زدہ ماحول اور پابندیوں کے خلاف لکھا۔ وہ معصوم لوگوں جو آزاد فضا کے لئے اپنا سب کچھ چھوڑ کر اتنی دور پیدل چل کر آئے وہ یہاں آ کر ایک عجیب گھٹن زدہ ماحول کا شکار ہو گئے۔ اپنی جان مال کی پرواہ کیے بغیر کئی دنوں تک سفر کرنے والوں کو ایک تلخ حقیقت کا سامنا کرنا پڑا۔ منیر نیازی کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ مہاجرین کی تکلیف کو شدت سے محسوس کرتے ہے۔ جس تصور کے ساتھ لوگوں نے اپنی جان، مال کی قربانی دی تھی عملی شکل میں ان کو ایسی زمین یا ایسا وطن نہ ملا۔ اس بات کا گلہ وہ "سفید دن کی ہوا اور سیاہ شب کا سمندر" میں کرتے ہے۔ وہ زندگی کے مشکل دنوں کی مسافت کو موضوع بناتے ہوئے نفرت اور بے وفا وراثت کا تذکرہ کرتے ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے محبت اور خوشیوں کے لئے ہجرت کی ان کو نفرت اور دکھ ملے۔ گھر جائیداد چھوڑ کر آنے والے یہاں بے آسرا اور بے یار و مددگار چھوڑ دیے گئے۔ منیر نیازی نے اس تکلیف کو محسوس کیا:

اس کڑی مسافت میں
راہ گزارِ آفت میں
اِک طویل نفرت کی
بے کنارہ عادت میں
بے شمار نسلوں کی
بے وفا وراثت میں (3)

ان اشعار میں منیر نیازی ہجرت کرنے والوں کی کیفیات کو قلم بند کرنے کی کوشش میں ہے۔ انھوں نے بڑے سادہ الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے گہری بات کی ہے۔ وہ کڑی مسافت اور طویل نفرت کی وجوہات اور سبب لکھتے ہے۔ وہ بے کنارہ عادت اور نسلوں کی بے وفا وراثت کا احتجاج کرتے ہے۔ ان کے یہاں ہر اس بات پہ احتجاج اور اعتراز ملتا ہے جو ناانصافی اور ظلم و جبر پر ہو۔ منیر نیازی کئی جگھوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب سے پاکستان معزوجود میں آیا ہے مسلسل تنزلی اور انتشار کی طرف جا رہا ہے۔ وہ یہ بھی

کہتے ہیں کہ غور وفکر اور اصلاح کرنے والوں کی تعداد وقت کے ساتھ کم ہوتی جارہی ہے اور اس کی بڑی وجہ اکثر رہنماؤں میں لالچ اور دنیاوی اسباب کے لئے دلچسپی ہے۔ پاکستان کا مسلسل زوال کا سبب حکمران طبقے کی خودغرضی اور عدم دل چسپی ہے۔ایسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مہاجرین مایوس اور پچھتاوے کا شکار ہوئے۔پُر اُمید لوگ نا اُمیدی کا شکار ہوئے۔ ایسے حالات میں صرف مکار اور چالاک لوگوں نے فائدہ اُٹھایا اور یہاں آ کر ملی بھگت سے مکانوں اور زمینوں پر ناجائز قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔اس کے مقابلے میں حق دار لوگوں کو ٹھیک سے روزگا کے مواقع بھی میسر نہ ہوئے۔منیر نیازی نے اکثر ان سب ناانصافیوں اور گھٹن پر اعتراز کیا۔ان کے یہاں وقتاً فوقتاً احتجاج کی آواز بلند ملی۔جیسا کہ " پہلی بات ہی آخری تھی" میں وہ حقیقت کی جستجو اور رفاقت کی بات کرتے ہے۔وہ کہتے ہے کہ ایک گمان ہے جسے سے نجات کا راستہ نہیں ہے:

تھی جس کی جستجو وہ حقیقت نہیں ملی
ان بستوں میں ہم کو رفاقت نہیں ملی
ابتک ہیں اس گمان میں کہ ہم بھی ہیں دہر میں
اس وہم سے نجات کہ صورت نہیں ملی
رہنا تھا اس کے ساتھ بہت دیر تک مگر
ان روز وشب میں مجھ کو یہ فرصت نہیں ملی (4)

منیر نیازی اوپر والے اشعار میں ان حقیقتوں کا تذکرہ کرتے ہے جس کی جستجو میں زندگی کے قیمتی لوگوں کی جانوں کا نذرانہ دیا۔وہ کہتے ہے کہ جن بستیوں میں سکون سے رہنے کا خواب لے کر لمبی مسافت طے کی وہ حقیقت میں کہی نظر ہی نہ آئی۔وہ ایک ایسے خواب کی بات کرتے ہے جسے حقیقت بنانے کے لئے بہت تگ و دو کی گئی ہے۔ان کے یہاں سکون اور خوشیوں سے بھری بستیوں اور معاشرے کا خواب ہے مگر جب حقیقت کی طرف قدم بڑھا تو سارے خواب ٹوٹ گئے، سارے گمان زمین بوس ہو گئے۔ اسی غم اور دکھ کے ساتھ زندگی گزری۔شاعر یہ بھی کہتے ہے کہ جس خواب یا گمان کے ساتھ لوگ ہجرت کے سفر پر گامزن

ہوئے اور وہ سب جھوٹ نکلے۔ان کی غزلوں میں ہجرت کا ذکر نمایاں اور ایک استعارہ کے طور پر ملتا ہے۔جس طرح ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجرت کا تجربہ ملتا ہے بالکل اسی طرح منیر نیازی کے یہاں بھی ہجرت کیا حساسات نمایاں ہیں۔اس لیے جب وہ اپنی شاعری میں ماضی کے حوالے سیلکھتے ہے تو اپنا خاندان، گھر، زمین، اپنے عزیز لوگ، ،بچپن کی خوب صورت یادیں اور اپنے عزیزوں کو یاد کرتے ہے:

خانپور!۔۔۔۔۔اے خانپور!
تیری گلیوں میں تھیں کیسی پیاری پیاری صورتیں
مسجدوں کے سبز در اور مندروں کی مورتیں

خانپور!۔۔۔۔۔۔اے خانپور!
کُنڈ پانی کے پہاڑوں کی دراڑون میں چھپے
صوفیوں کی خانقاہیں تیری حد سے کچھ پرے(5)

اسی لیے ان کے یہاں زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کے متعلق خوف نظر آتا ہے۔یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہجرت کے اس سارے عمل نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھرنے میں مدد کی۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں پرانی بستی کے گھروں، گلیوں اور راستوں کے نشان اور اُجڑے دیار کے نقش ملتے ہیں۔منیر نیازی کے یہاں ہجرت کا تجربہ، داخلی وخارجی ہجرت کے نتائج، دوستوں کے بچھڑنے، زندگی اور تہذیب کے ایک حصے کے گم ہو جانے کا احساس ملتا ہے۔وہ یہ تصور پیش کرتے کہ اب بڑی بڑی عمارتیں اور مکان عالیشان تو بن گئے ہیں مگر اپنے مکینوں سے خالی کھوکھلے ہیں اور یہی ویرانی دراصل آسیب زدہ ہے۔انھوں نے شہری زندگی کے مسائل کو بھی موضوع بنایا۔شہر کے شور شرابے اور کھوکھلے پن کو انھوں نے بڑی قریبی سے دیکھا اور اس کی افسردگی کو محسوس کیا۔درددل رکھنے والے لوگ شہر کی بے باک اور آلودہ فضا میں گھٹن محسوس کرتے ہیں۔شہری زندگی جہاں اپنی آلودگی کی وجہ بہت سی بیماریوں کا سبب بنتی ہے وہاں حساس لوگوں کے لئے بھی زمین تنگ کر دیتی ہے۔اسی لئے اکثر دیکھا گیا ہے کہ شاعر اور ادیب شہروں سے دور جانے کی باتیں کرتے ہیں:

اس کتاب رنگ ونکہت کے علاقوں سے پرے
شہر کی خبروں سے کچھ افسردہ سا ہے دل مرا
فکرِ ہست و بود کی دیوانگی میں مبتلا ہے دل مرا
در سے باہر آ کر دیکھو، دور تک میدان میں (6)

اب دیکھیے اس شعر میں شاعر مصروف اور شور زدہ شہروں سے تنگ اور اکتائے ہوئے ملتے ہے۔ ویسے بھی منیر نیازی کے ہاں زیادہ تر شہر کی علامت منفی پائی جاتی ہے۔ وہ شہر کی بے ہنگم اور بے حسی والی زندگی کے سخت خلاف ہے۔ منیر نیازی شہر کے بے حس اور احساس سے خالی لوگوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہے۔ شہری زندگی میں سہولیات تو ہیں جو زندگی کو آسان بنانے کے لئے معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف ان سہولیات اور آسائشوں کے بدلے میں بے حسی اور بداخلاقی عروج پر ہے۔ اسی طرح ''چھے رنگین دروازے'' میں دو مصروں کی چھوٹی سی نظم میں شہری مکانوں میں رہنے والے مشینی اور احساسات سے خالی لوگوں کو تنقید کا نشانہ بنایا:

ان مکانوں میں ہے کیا
بے روح لوگوں کے سوا (۷)

منیر نیازی کے یہاں ہمیں ہر وہ موضوع اور ہر وہ تجربہ ملتا ہے جو ایک عام انسان کا ہوتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ وہ عام انسانوں کے ہر دل عزیز ہے۔ ان کے یہاں ہمیں صرف تلخ نوائی ہی نہیں ملتی بلکہ زندگی کے خوبصورت لمحات کی منظر کشی بھی ملتی ہے۔ نظم، غزل کے ساتھ انھوں نے گیت بھی لکھے جن میں سے کچھ بہت مقبول ہوئے۔ گیت ایسی نظم کو کہا جاتا ہے جو سُر اور ترنم سے گایا جاسکے۔ اردو ادب میں گیت امیر خسرو کے زمانے سے لکھنے شروع ہوئے اور تا حال یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس کو لکھتے ہوئے گیت نگار اپنی داخلی خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اصنافِ ادب میں گیت نگاری کا منفرد اور الگ درجہ ہے۔ منیر نیازی نے فلموں کے لیے گیت لکھے شاید اسی لیے کچھ لوگ ان کو فلمی شاعر بھی کہتے ہیں۔ انھوں نے فلم کے لیے تقریباً پچاس کے قریب گیت لکھے۔ منیر نیازی نے 1958ء میں پہلی مرتبہ فلم "نئی لڑکی" کے لیے گیت لکھنے کا تجربہ کیا اور پھر یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ 1959ء اور 1960ء میں فلم " آج کل"

اور " لگن" کے گیت بھی انہی کے قلم سے نکلے اگر چہ اب تک ان کے گیتوں نے مقبولیت حاصل نہ کی۔مگر 1962ء میں یہ گیت "اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو" بہت مقبول ہوا۔یہ گیت فلم "شہید" کے لیے لکھا گیا۔1962ء میں منظرِ عام پہ آنے والی فلم "سسرال" میں ملکہ ترنم نور جہاں کا گایا ہوا یہ گیت "جا اپنی حسرتوں پہ، آنسوں بہا کے سو جا" بہت مشہور ہوا اور اسی فلم میں مہدی حسن کا گایا ہوا یہ گیت بھی بہت مقبول ہوا:

جس نے مرے دل کو درد دیا
اس شکل کو میں نے بھلایا نہیں
اک رات کسی برکھا رُت کی
کبھی دل سے ہمارے مٹ نہ سکی(8)

منیر نیازی نے اگر چہ یہ گیت کی شکل میں لکھا ہے مگر اس میں احساس اور تخلیقی مزاج پورا ہے۔ایسا نہیں کہ گیت ہے تو صرف رومانی لہجے میں لکھنا ہے۔انھوں نے اس میں بھی فکری صلاحیت کا مظاہرا کیا ہے۔اس گیت میں وہ محبوب کی بے وفائی کی بات کرتے ہوئے اپنے دل کا درد بیان کرتے ہے۔وہ کہتے ہے کہ محبوب چاہے دور ہو یا نزدیک اس کی یاد ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔اگر وہ کبھی چاہے کہ محبوب کو بھلا دے تو ایسا ممکن نہیں لگتا۔ایسی صورت میں دل بغاوت پہ اُتر آتا ہے۔ان کی بہت سی نظموں اور غزلوں میں ترنم کی خوبیاں ہیں۔ان کے گیتوں میں جذبات کی شدت اور احساسات کی گہرائی ہے۔ان کے گیتوں کو نفیس اقبال ان کے آبائی علاقے ہوشیار پور سے جوڑتے ہوئے یہ خیال پیش کرتے ہے کہ برندابن اور رادھا کرشن صرف علامتیں ہیں۔اصل میں وہ ان کی وادی یا علاقے کی سندر ناریاں ہیں۔وہ کہتے ہیں:

"منیر نیازی کے گیتوں میں روپ نگر اور پریم نگر کا تذکرہ اُس کو اپنی خوب صورت وادی کی یاد دلاتا ہے۔اس کے گیتوں کی سندر ناریاں اس کی اپنی بستی کی ہی چنچل دوشیزائیں ہیں جنھیں اشفاق احمد نے " دشت وفا کی خوب صورت ہرنیاں " کہا ہے"(9)

منیر نیازی کے یہاں تخیل کی الگ دنیا ملتی ہے۔جن میں بہت سے حقیقت سے ماورا کردار بھی پائے جاتے ہیں۔وہ ان کرداروں کو حقیقی رنگ دے کر زندگی کے مختلف رنگوں کی بات کرتے ہے۔اس کے علاوہ ان کے یہاں نسائی کیفیت اور جذبات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ اس کے لئے ان کا انداز اور لہجہ مختلف ہے۔وہ کسی بھی جذبے کے اظہار کے لئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لیتے۔انھوں نے نسائی جذبات کے اظہار کے لئے زیادہ تر گیت کا سہارہ لیا:

"منیر نیازی نے گیت بھی لکھے۔انھوں نے گیت کے مزاج کو سمجھتے ہوئےاس کے مخصوص آہنگ اور لہجہ میں لکھے اور نسائی کیفیات کا اظہار فنکارانہ انداز سے کیا۔"(10)

گیت نگاری کے حوالے سے ان کی تخلیقی شخصیت کا ایک مختلف پہلو نظر آتا ہے جو نظم اور غزل میں نہیں نظر آتا۔اگرچہ ان کا تخلیقی انداز گیتوں سے اتنی مناسبت نہیں رکھتا۔انھوں نے فلم "اونچے محل" کے گیت بھی لکھے۔1963ء میں انھوں نے دو فلموں "شکوہ" اور "قتل کے بعد" کو مقبول گیت دیے۔ 1965ء میں ان کا لکھا ہوا یہ گیت بہت مقبول ہوا، جسے مہدی حسن نے گایا:

جب بھی گھر کی چھت پر جائیں ناز دکھانے آ جاتے ہیں
کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آ جاتے ہیں
دن بھر جو سورج کے ڈر سے گلیوں میں چھپ رہتے ہیں
شام آتے ہی آنکھوں میں وہ رنگ پرانے آ جاتے ہیں
جن لوگوں نے ان کی طلب میں صحراؤں کی دھول اڑائی
اب یہ حسیں ان کی قبروں پر پھول چڑھانے آ جاتے ہیں(11)

اس گیت کا انداز تھوڑا شکایتی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ زندگی میں بہت سے ایسے لوگوں سے سامنا ہوتا رہتا ہے جسے ہم پسند نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو جب بھی دیکھو انسان کا دل جل جاتا ہے۔اگلے شعر میں وہ کہتا ہے کہ سارا دن یادوں سےچھپ چھپا کے شور وغل میں کاٹا جاتا ہیمگر رات ہوتے ہی تنہائی میں محبوب یاد آ جاتا ہے۔وہ یہ گلہ بھی کرتا ہے کہ جن لوگوں کے

لئے وہ زندگی بھر خوار ہوا وہ پارسا بن جاتے ہے۔منیر نیازی کے گیتوں میں ویسا اسلوب، تخیل کی راوانی اور شعری آہنگ نہیں ملتا جیسا ان کے یہاں نظم اور غزل کے میدان میں ہے۔انھوں نے گیتوں میں روایتی انداز کو ترجیحی دی۔گیتوں میں ان کے دھیمے اور مدہم لہجے نے تیکھا پن پیدا کیا۔انھوں نے گیت نگاری میں صوتی آہنگ اور صنعتوں کو بھی مدنظر رکھا۔ جیسا کہ "تیز ہوا اور تنہا پھول" میں یہ گیت ہے:

کس کس سے ہم پریت نبھائیں
کون سی مورت من میں بٹھائیں
سانجھ سویرے کس کو ڈھونڈنے
کُنج گلیوں میں جائیں
کس سے پریت نبھائیں (12)

اب دیکھے وہ سوال کرتے نظر آتے ہے۔وہ کہتے ہے کہ کون ہے جس سے محبت کی جائے؟ کون ہے ایسا جس کا چہرہ دل کو بھائے؟ شاعر اس چہرے، اس دل اور اس انسان کی تلاش میں ہے جس سے شاعر دل کی باتیں کرے۔ان گیتوں کے علاوہ انھوں نیا ور موضوعات پر بھی گیت لکھیانھوں نے ملی گیت بھی لکھے۔1966ء میں فلم تقدیر کے لیے یہ مقبول گیت لکھا۔" کیسا نشہ ہے، میں کس عجب خمار میں ہوں" 1968ء میں فلم "دھوپ اور سائے" اور 1976ء میں "خریدار" کے لیے بھی گیت لکھے۔جس میں یہ گیت آج بھی مقبول ہے۔"زندہ رہیں تو کیا جو مر جائیں ہم تو کیا" اس کو ناہید اختر نے گا کر لازاول کر دیا۔جیسا کہ انھوں نے گیت زیادہ نہیں لکھے اس لئے ان کے یہاں اس کو امتیازی حثیت بھی حاصل نہیں۔شائد یہ ہی وجہ ہے کہ کچھ ادیب ان کو نظم اور غزل کا نمائندہ شاعر بھی تصور کرتے ہے۔شمی فاروقی نے اردو گیت نگاری میں منیر نیازی کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے اس طرح لکھا ہے:

"سیف الدین سیف، احمد راہی اور منیر نیازی کا شمار نظم اور غزل کے نمائندہ شعراء میں ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے گیتوں میں نظم و غزل کا جمالیاتی رچاؤ پایا جاتا ہے۔تخلیقی

اعتبار سے ان کے یہاں گیت کو امتیازی حثییت حاصل نہیں۔
ان شعراء نے گیت اپنی ضرورت کے تحت لکھے، ادبی مقاصد
کیلیے نہیں" (13)

ان کی شاعری کے مطالعہ سے ان کے شعری اوصاف اور اندازِ بیان کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔انھوں نے اپنے موضوعات سے جذبات کی گہرائی کو ماپنے کی سعی کی ہے اور ایسے موضوعات پر لکھا جو عام قارئین کو سمجھ آ سکے۔شبِ ویراں، بازگشت اور ملن کی رات جیسی نظموں کے مطالعہ سے ان کی تخلیقی قابلیت کا احساس ہوتا ہے۔ان کے ہاں روایت اور انفرادیت کا خوبصوت امتزاج ملتا ہے۔ان کے گیتوں میں تذکیروتانیث کی روش پائی جاتی ہے۔ وہ مرد کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کلاپے اور وجودی کرب کی کیفیت کا اظہار کرتے ہے۔ان کی غزلوں اور نظموں میں تنہائی اور وجودیت مرکز ہے۔ان کا ہاں واقعات کا من وعن بیان نہیں ملتا۔ان کے گیتوں میں مشرقی آہنگ اور ہندی تاثرات کی فضا محسوس کی جاسکتی ہے۔وہ اپنے بارے میں بہت محتاط اور حساس تھے زیادہ لوگوں میں گھلتے ملتے نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

" مجھے ڈر لگتا ہے کہ مجھے کوئی چرا نہ لے۔ میں ایک خوف میں
مبتلا رہتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے یا ویسا نہ ہو جائے۔ یہ خوف
ہمارے پورے معاشرے پر مسلط ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ آپ
کسی سے ملتے ہیں نہ پی آر بناتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں خود
سے ملتا ہوں۔میرے لیے بس یہی کافی ہے۔" (14)

ان کے ہاں نظم، غزل اور گیتوں میں علامتیں، استعارے، فطرت نگاری اور لفظیات کی شاعرانہ فضا محسوس کی جاسکتی ہے۔اگر چہ ان کے گیتوں میں استعارے مختلف نہیں ہے مگر ان میں تسلسل کی وجہ سے جاندار اور علامتی اسلوب کی گہرائی تاثرات سے بھر پور ہے۔ ان کے ہاں مذہب کا استعارہ نمایاں ہے۔ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے مذہب ان کی بھی زندگی کا اہم ترین پہلو ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں زندگی کی مشکلات اور پریشانیوں

کا ذکر کرتے ہوئے دین سے رہنمائی لی۔جیسے وہ ہجرت پاکستان کو ہجرت مدینہ سے منسوب کرتے اور راستے میں آنے والی مشکلات کا تذکرہ کرتے ہے۔انھوں نے اپنی کتاب "تیز ہوا اور تنہا پھول" کا انتساب 'خدا کے نام' کیا۔"ماہ منیر" کا 'رسولِ کریم ﷺ کے نام'، "دشمنوں کے درمیان شام" کو 'امام حسینؑ کے نام' جبکہ "چھ رنگیں دروازے" کو وہ 'خوب صورت پاکستان' سے منسوب کیا۔ پاکستان ان کے لیے "نیا مدینہ" ہے۔منؔیر نیازی اس حوالے سے 'نظریاتی' شاعر نہیں ہے۔انھوں نے حمد اور نعتیں لکھیں۔"چھ رنگیں دروازے" کو حمد سے شروع کرتے ہوئے لکھتے ہے:

چپ گلی محلے میں
شام کی طرح آیا
بے شمار باغوں پر
ابر کی طرح چھایا
خواب میں کبھی آیا
سامنے کبھی آیا(15)

جیسا کی اوپر انھوں نے ایسے اپنے خیالات کو پیش کیا۔کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔اس کے نشان ہمیں ہر سمت ملتے ہے۔خاموشی میں،شور میں،اندھیرے میں،روشنی میں،آسمان اور زمین کے خلا میں ہر جگہ اگر کوئی موجود ہے تو وہ ایک ہی ذات ہے۔وہ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔اس ذات کو کبھی نیند آتی نہ اُونگھ۔سب سے پاک اور سب سے اعلیٰ ذات ہی باری تعالیٰ کی ہے۔شاعر اللہ کی صفات بیان کرتے ہوئے اس کے موجود ہونے کے بارے میں لکھتا ہے۔انھوں نے اسلوب کی تشکیل میں سادہ الفاظ کو اپناتے ہوئے موجود علامتیں واضح پیش کیں

منیر نیازی کی نظموں اور غزلوں میں وحشت کی کیفیت سے لے کر ماضی کی باز یافت تک،گم شدہ زمانے سے لے کر عزیزوں واقارب کے بچھڑ جانے تک،اور پھر ہجرت کے حالات کا پس منظر سب ملتا ہے۔ان کے ہاں غزلوں کا انداز بیان اور منفرد علامتی اسلوب ملتا

ہے۔ان کے ہاں عمرِ رائیگاں کا ماتم اس تناظر میں ملتا ہے کہ نہ ہماری آزمائش ختم ہوتی ہے اور نہ ہی مقصدِ حرکت۔ان کی غزل کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے خود اپنی سوچ کی گہرائی اور جذبات کے اظہار کے سانچے واضع کیے۔تقسیم کے بعد لوگوں کے بدلتے ہوئے رویے اور احساس کی وجہ سے ان کے یہاں ایک طرح کی حیرانگی، ماضی کے تلخ تجربوں کے نشان اور طبیعت کی سادگی ہونا ایسا شعری رویہ ہے جو ان کے ہم عصروں میں کم نظر آتا ہے۔ان کی شاعری وجود کی آواز ہے۔ایسی آواز جس کے ساتھ خوف ہمیشہ جڑا ہو۔ان کی شاعری اس لیے بھی مختلف ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں علامتوں کے ذریعے گہرے اور پیچیدہ معانی و مطالب کو آسان کرنے کی کوشش کی۔ان کی شاعری میں مرکزی علامتوں میں موت، پرندوں کی ہجرت، ستارے، آدھی رات کا شہر، جنگل کی زندگی اور جادو، پانی، صبح کا گلابی منظر، شام کا سورج، مکان کی ویرانی، شجر، آئینہ اور خواب وغیرہ شامل ہیں۔جیسا کہ انھوں نے نظم " کوششِ رائگاں" میں لکھا:

ابھی چاند نکلا نہیں
وہ ذرا دیر میں اُن درختوں کے پیچھے سے اُبھرے گا
اور آسماں کے بڑے دشت کو
پار کرنے کی اک اور کوشش کرے گا(16

اس میں منیر نیازی نے نظم کا عنوان ہی علامتی استعمال کیا ہے۔ایک بے مقصد کوشش کا ذکر کرتے ہے۔یہ ایک آزاد نظم ہے جس میں ایک مسلسل سفر کا ذکر ہے۔انھوں نے ان علامتوں اور استعاروں کے ذریعے انسانی رویوں، معاشرے کے مسائل اور شہری زندگی کے تصادم کو پیش کیا ہے۔وہ اپنی شاعری میں ایسی فضا بناتے ہے کہ خارجی اور باطنی عناصر مل کر قارئین کے احساس کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہے۔ان کے یہاں تین بڑی علامتیں ہیں۔ "موت، ہوا اور شام" ان تینوں کو منیر نیازی نے کثرت سے استعمال کیا۔انھوں نے اپنے کلام میں لمبی باتوں اور کہانیوں کی بجائے مختصر اور جامع انداز اپنایا یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں ان کی بات نقش ہو جاتی ہے۔کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کی ان کی شاعر میں طلسم

ہے، اسے طلسمی حقیقت نگاری بھی کہا جا سکتا ہے۔ان کی پہلی کتاب "تیز ہوا اور تنہا پھول" جس میں انھوں نے استعارات کا استعمال خوبصورتی سے کیا۔ "تنہا پھول" کو شاعر نے اپنی تنہائی اور اکیلے پن کے ساتھ منسوب کیا۔ اسی طرح انھوں نے "موت" جیسی المناک سچائی کو جمالیاتی رنگ میں پیش کیا:

ہر طرف خاموش گلیاں زرد رُو گونگے مکیں
اُجڑے اُجڑے بام و در اور سُونے سُونے شہ نشیں
ممٹیوں پر ایک گہری خامشی سایہ فگن
رینگ کر چلتی ہوا کی بھی صدا آتی نہیں (17)

ان کی شاعری طویل جلاوطنی کے بعد وطن کی پہلی جھلک کی مانند ہے۔ان کے شاعری کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بھولی ہوئی باتوں اور گم شدہ تجربوں کو زندہ کرنے کی ایک غیر معمولی صلاحیت ہے۔ان کی جدوجہد کا راستہ مختلف ہے ان کی کے یہاں فکری و فنی سطح اس طرح مضبوط ہے کہ قارئین ان کے تخیلاتی تصور میں ڈوب جاتے ہیں۔ان کی شاعری میں لفظوں کی معنویت کو اہمیت حاصل ہے۔یہ اپنے شعروں میں اس طرح کی صورتِ حال کو پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہے کہ قارئین میں معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے لیے جذبہ اُبھرے۔منیر نیازی کے یہاں انسان کے بدلتے ہوئے رویے کے لیے گہری سوچ و بچار ہے اسی سوچ اور فکری انداز سے ایک خاص طرح کی فضا تخلیق پاتی ہے۔ان کے یہاں انسان خواہشات میں ایسے سفر کا حصہ بن گیا ہے جو آگے کو چلتا جا رہا ہے اور واپسی کا کوئی امکان نہیں۔قارئین کو ان کے یہاں زمان و مکان کی تخلیقی قوت کو ایک ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے اور یہ ایسا رویہ ہے جو خواب ناک اور پُراسرار بھی ہے۔ایک غزل میں لکھتے ہے:

آزردہ ہے مکان میں خاک زمین بھی
چیزوں میں شوقِ نقلِ مکانی دیکھ کر
ہے آنکھ سُرخ اُس لبِ لعلیں کے عکس سے
دل خوں ہے اس کی شعلہ بیانی دیکھ کر (18)

انھوں نے شاعری میں علامتوں اور استعاروں کو استعمال کر کے مکان اور اس کے لوازم سے خیال اور منظر تعمیر کیے کہ جس میں آفت زدہ شہر کا عکس دکھائی دیتا ہے۔شائد اسی لیے موجودہ بستی کی ویرانی ، قدیم بستیوں کو مزید ویران اور دہشت ناک بنا دیتی ہے۔ ان کے شاعری میں استعمال ہونے والے استعارے اور تلمیحات پر غور کرنے والے اپنے اردگرد سے لاتعلق ہو جاتے ہیں پھر یہ ہی لاتعلقی ان کو اپنی ذات کے پاتال میں اُتار دیتی ہے۔انتظار حسین نے کہا کہ منیر نیازی کا دور " منیر نیازی کا کوفہ " ہے۔ اس سے شاعر کا اپنے عہد اور لوگوں کے ساتھ گہرے رشتے کا پتہ چلتا ہے۔جبکہ سلیم الرحمٰن کہتے ہے کہ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے ہوا کی آواز میں موت کی صدا آتی ہے۔ تیز ہوا کے جھونکے سے ٹوٹنے والی مرجھائی پتیوں کو بھی انھوں نے اس کے ساتھ ہی جوڑا ہے۔محمد سلیم الرحمٰن کہتے ہے:

> "ہمارے دلوں کو ڈھارس دینے اور خود اپنے ذہن کو اُجالنے کی خاطر، تضاد کو نمایاں کرنے کیلیے ،منیر ہمیں اس صبح کی جھلکیاں بھی دکھاتا رہتا ہے۔ جو ہمارا بچپن تھی ، جب رنگ زندہ ، ہوا تازہ اور آنکھیں روشن تھیں ، اور اس خوبصورتی اور صداقت کی جھلکیاں بھی ، جو بڑھتی ہوئی کمینگی اور بے حسی کے باوجود اب بھی کہیں کہیں دلوں میں ، چہروں پر ، باتوں میں اور فطرت کے مظاہر میں باقی ہیں۔"(19)

منیر نیازی نے فطرت نگاری کو نہایت فنکارانہ انداز میں معنی عطا کیے۔ایک شاعر جب معاشرے کی بدصورتی کی بات کرتا ہے تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ خوبصورت مناظر اور فطرتی حسن سے ناواقف ہو۔منیر نیازی کے یہاں جب رات کے اندھیرے کا ذکر ملتا ہے تو صبح کی تازہ ہوا اور سنہری روشنی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ان کے یہاں جب ویران جنگلوں کی دہشت ملتی ہے تو وہی ہمیں پھل پھول کہانیاں سناتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ کہیں تپتی ہوئی دھوپ کو موضوع بناتے ہے تو کہیں بادل کی بوندوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ان کے الفاظ کا اپنا رویہ اور اپنا موسم ہے۔جیسے نظم " ثابت وسیار ساعتیں " میں لکھتے ہے:

"صبحِ بہار میں اسے
جا کے مِلوں گا میں
جس سے بچھڑ گیا تھا میں
عہدِ خزاں کی شام میں (20)

یہاں پہ بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑی دل چسپی سے صبحِ بہار اور عہدِ خزاں کو یاد کیا ہے۔ ان کی شاعری کی خوبصورتی ہی یہ ہے کہ کبھی کسی نظم میں کچھ کھو جاتا ہے تو کبھی کسی غزل میں کچھ مل جاتا ہے۔ ان کی شاعری کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں تنہائی بے باکی سے دروازہ کھولے اندر آتی ہے اور ماضی کی یادوں کو چھیڑنے لگتی ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات کی شدت، جمالیاتی لہجے کی بناوٹ اور اسلوب کی خوبصورتی ملتی ہے۔ جیسے انھوں نے یہاں الفاظ کے اُتار چڑھاؤ سے بیان کی ہے:

ہم زبان میرے تھے ان کے دل مگر اچھے نہ تھے
منزلیں اچھی تھیں میرے ہم سفر اچھے نہ تھے
جو خبر پہنچی یہاں تک اصل صورت میں نہ تھی
تھی خبر اچھی مگر اہل خبر اچھے نہ تھے
بستیوں کی زندگی میں بے زری کا ظلم تھا
لوگ اچھے تھے وہاں کے اہل زر اچھے نہ تھے (21)

فاطمہ حسن "سفید دن کی ہوا اور سیاہ شب کا سمندر" میں ان کی اسی تخلیقی خوبی اور الفاظ فراوانی کو سراہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو یا کوئی خود سے باتیں کر رہا ہو۔ وہ کہتی ہے کہ ان کی شاعری میں معصوم بچے جیسی حیرت ہے۔ وہ لکھتی ہے:

"منیر نیازی کے ڈکشن (diction) کی یہی خوبی ہے کہ ان کی شاعری میں معنی کے ساتھ ایک فضا بھی ملتی ہے۔ ایسی فضا جو پراسرار حسین اور خوابناک ہے جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو یا

خود اپنے آپ سے کلام کر رہا ہو۔"(22)

انھوں نے اپنے دور کی نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے انسان کے بنیادی مسائل کی بات کی ہے۔ وہ اس مصنوئی اور بناوٹی روایوں میں انسانی خوبصورتی اور حقیقی رنگ کی تلاش میں ہے۔ وہ کائنات کو بچوں کی طرح حیرانی اور تجسس سے دیکھتے۔ ان کے ہاں ہر مسئلے، ہر عمل، اور ہر الجھن پر گہرا مشاہدہ نظر آتا ہے۔ وہ ایک شے میں دوسری شے تلاش کرتے ہے۔ اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے قارئین کے ذہین میں ایک ایسا انسان ابھرتا ہے جو اس دنیا سے بے خبر اپنی دنیا میں مگن ہو۔ فاطمہ حسن "سفید دن کی ہوا اور سیاہ شب کا سمندر" میں ان کی شعری خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہے:

"منیر نیازی کی غزلوں کے بہت سے اشعار یاد رہ جاتے ہیں۔ یہ خوبی تو غزل کی صنف میں ہے پر نظموں کا یاد رہ جانا حیرت ناک ہے۔ منیر نیازی کی اکثر نظمیں ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں اور جب یاد آتی ہیں تو اپنے پورے تاثر کے ساتھ۔ ان کی نظموں میں لفظوں کی روانی کے ساتھ ساتھ گزرتے ہوئے منظروں کی روانی ہے جیسے کوئی فلم نظروں کے سامنے سے گزر رہی ہو جیسے کوئی سفر میں ہو اور کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہا ہو۔ یہ پیرائیہ اظہار منیر نیازی نے لاشعوری طور پر اختیار کیا ہے یا شاید اندرونی آنکھ کیا ہے۔ کہ شاعر بیک وقت چیزوں کو دو انداز میں دیکھ رہا ہے۔"(23)

ان کے ہاں محبت کے حوالے سے اثر انگیز کیفیت ملتی ہے۔ انسان اچھی اور خوبصورت چیزوں کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہ ہی رجحان دراصل محبت کی بنیاد بنتا ہے۔ منیر نیازی کے ہاں بھی اس طرح جستجو کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں دل کی خواہشات کو پورا کرنے کی جستجو ملتی ہے۔ ان کا یہ رویہ اور خوبی ان کی شاعری کو وسعت اور بصارت عطا کرتی ہے۔ ان کی نظم " کیسے پھر اس عہد کو زندہ کروں" میں رومانوی مزاج کے ساتھ ساتھ تخلیقی

وجدان کو بھی ملتا ہے:

اپنی اپنی زندگی میں مبتلا اتنے رہے
سارا کچھ دھندلا گیا ہے ہم جُدا اتنے رہے
اس کے کس رُخ کو اشارہ عشق کا کیسے کروں
اس ذرا سے کام کی ابتدا کیسے کروں (24)

ان کے نظموں کے مطالعہ سے ان کے شعری رویوں اور انداز کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔انھوں نے اپنے پسندیدہ موضوعات سے اپنے جذبات واحساسات کو گرفت میں لینے کی سعی کی ہے۔ایسے موضوعات پر ان کے ہاں تکرار ملتی ہے۔شبِ ویراں، بازگشت اور ملن کی رات جیسی نظموں میں ان کی تخلیقی قابلیت کا احساس ہوتا ہے۔مجید امجد " جنگل میں دھنک" کے تعارف میں لکھتے ہے:

"اس کے کلام کے بارے میں جو کچھ میرا تاثر ہے۔اس کے اظہار میں میں اپنے ذاتی تعلقات کو مخل نہیں ہونے دوں گا مجھے سب سے ذیادہ اس کی شاعری کی وہ فضا پسند ہے، وہ فضا، جو اس کی زندگی کے واقعات، اس کے ذاتی محسوسات اور اس کی شخصیت کی طبعی افتاد سے اُبھرتی ہے۔اس نے جو کچھ لکھا ہے جذبے کی صداقت کے ساتھ لکھا ہے اور اس کیا حساسات کسی عالمِ کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس کی اپنی زندگی کی سطح پر کھیلنے والی لہریں ہیں۔انہی نازک، چنچل، بے تاب، دھڑکتی ہوئی لہروں کو اس نے انسانی جذبے کے ایسے گریز پا پہلوؤں کو بھی اپنے شعر کے جادو سے اجاگر کر دیا ہے جو اس سے پہلے اس طرح ادا نہیں ہوئے تھے۔یہی منیر نیازی کا کمالِ فن ہے"(25)

ان کے شعروں میں مافوق الفطرت کردار ہے جسے چڑیلیں، جنگل، ستارے، پیچھے مڑ کر مت دیکھنا، شامِ فراق، دشت مرگ، شہر در بند، شہر کا سانپ کی صفات اور چاند کا ڈھلنا

جیسی لفظیات و تراکیب سے مخصوص طرح کی امیجری تخلیق کی گئی ہے اور ان کی مدد سے ایک پُر اسرار فضا تشکیل دی گئی ہے فضا سازی اور تخیل کی تعمیر ان کے علامتی مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔انھوں نے شہری زندگی کو مسلسل تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ شہر کی مادی زندگی، ظاہری آسائش و آرام کی فراہمی کو پریشانی، اکیلا پن اور ذہنی دباؤ کے ساتھ جوڑتے ہے۔وہ اکثر اپنی نظموں اور غزلوں میں شہری زندگی کو آفت زدہ جنگل کہتے ہے۔ان کی نظم "اشارے" بھی اسی زمرے میں لکھی گئی جس میں شہری مکانوں کی ویرانی اور خواہشات کی فراوانی کا تذکرہ ہے۔وہ شہر کے نظام زر کو انسانی زندگی کے زوال کا سبب سمجھتے ہے۔نظامِ زر جو ہماری زندگیوں میں اس قدر حاوی ہو چکا ہے کہ ہم احساسات اور جذبات سے عاری ہو کر مادی چیزوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔اس لحاظ سے وہ شہری نظام کو دشمن مانتے ہے:

سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستا نہیں
ویراں پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں (26)

یہاں وہ مکان کی ویرانی کی بات کرتی ہوئے کہتے ہے کہ شہری زندگی میں سجاوٹ اور آسائش تو ہے مگر زندگی کے رنگ نہیں ہے۔اسی طرح وہ " دشمنوں کے درمیاں شام " میں ایک نظم میں لکھتے ہے۔کہ ان مکانوں، ان گھروں میں کوئی آسیب ہے جو یہ آباد نہیں ہے۔اس میں رہنے والے کسی ایسے سفر پر گئے ہیں جس کا راستہ نہیں مل رہا لوٹے آنے کی اُمید بھی نظر نہیں آرہی:

اک آسیب زر ان مکانوں میں ہے
مکیں اس جگہ کے سفر پر گئے
بہت دھند ہے اور وہ نقشِ قدم
خدا جانے کس رہ گزر پر گئے (27)

اس شعر میں آسیب زدہ مکانوں کی آہ و پکار واضح سنائی دیتی ہے جو اپنے مکینوں کے

انتظار میں ہے اور مکان اپنے مکین کے وجود کی طرف اشارہ کرتا ہے۔اس میں تشبیہ اپنی جدت اور ندرت میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔''مکیں'' کی ترکیب ایک ایسا بصری پیکر ہے جو گھما گھمی اور حرکت میں ہیدھند کو گمشدگی کے ساتھ جوڑا ہے۔اس میں واپس نہ آنے کا گِلہ ہے، جیسے کوئی سفر پر جائے اور واپس آنے کا راستہ بھول جائے:

انھیں دیکھتا ہوں میں چپ کھڑا
جو گزر گئے انھیں سوچتا
یہ شجر جو شام خزاں میں ہیں
کو مکاں ہیں ان کے قریب کے
انہی بام و در مقیم تھے
وہ مکیں شہر قدیم کے (28)

اس میں شاعر خاموش کھڑا خزاں کی اجڑی شاموں کی ویرانی کا تصویر پیش کرتا ہے۔خزاں ان کا پسندیدہ استعارہ ہے، اس کے لیے بھی دیکھا جائے تو منیر نیازی نے اپنی محبوب شعری خوبی" مکان اور اس کے لوازم" کو استعمال کیا ہے۔یہاں منیر نیازی نے شہر کی ان گلیوں کا منظر پیش کیا ہے جو ان کے دل میں بستی ہے۔وہ بستی جو 1947ء میں چھوڑ کے آئے تھے۔منیر نیازی نے یہ خیال پیش کیا کہ موسمِ خزاں اور آفت زدہ مکاں کبھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔اس کا شہر اور اس شہر میں آباؤ اجداد کی حویلی نشانی تھی،منیر نیازی کی زندگی کا یہ حصہ ان کے لیے ایک ناگزیر حصہ بن چکا ہے۔یہی وجہ ہے کہ غم والم کی شدت کیباوجود اس شعر میں طنز کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ان کے یہاں شاعری بے معنی نہیں ہے۔بلکہ ان کے یہاں غزلیں اور نظمیں ان کے پیغام اور معنی کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔اس حوالے سے سعادت سعید لکھتے ہے:

"منیر نیازی کی نظموں کا کشف ہماری تہذیب کے یک طرفہ رجحان سے پیدا ہوتا ہے ایک ایسے رجحان سے جو دھوپ کی طرح بے رنگ اور پیتل کی طرح بدنما ہے۔اس رجحان کے زیر

اثر نمودار ہوتی ہوئی دنیا میں ہر طرف تنہائی اور دشمنی بے توجہی
اور افسردگی دیتی ہے۔شاعر اس بدنما دنیا کی تصویر پیش کرتے
ہوئے قاری تک اس تصور کو پہچانا چاہتا ہے کہ جسے اس کی
آنکھیں دیکھتی ہیں وہ تہذیب جس کی طرف یہ مختلف نظمیں
رہنمائی کرتی ہیں ایک ایسے آشوب میں گرفتار ہے جہاں اس کو
اپنی منزل کا علم بھی میسر نہیں ہے۔"(29)

ان کا کہنا ہے کہ یہ ہی ظاہری اور مادی چمک دمک انسان کی اخلاقی اور روحانی اعتبار سے زوال کی سبب ہے اسی لیے منیر نیازی نے اس بات کا بار بار ذکر کیا کہ میرا ملک آسیب زدہ ہے۔ اگر اس بات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو" آسیب "لفظ غیر انسانی فضا کو تشکیل دیتا ہے کیونکہ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ انسان ارتقا کی جانب مائل ہے مگر یہ کیسا ارتقا ہے جو جذبات واحساسات سے عاری معاشرے کی تعمیر کر رہا ہے:

اُونچی اُونچی دیواروں والے نیم آباد محلےکی سنسان گلیوں،
کم افراد والے کشادہ چوک سے نکل کر
دونوں اکٹھے چل رہے ہیں(30)

ان مصروں میں شاعر نے ایک طرف" اُونچی اُونچی دیواروں" کی طرف اشاریہ اور دوسری طرف" کشادہ چوک "ایک بامقصد اور بامعنی حرکت کا اعلان ہے۔اس شعر میں شاعر نے دنیا کے اخلاقی اور روحانی اقدار سے خالی اور بدنما ہو جانے کا احتجاج کیا ہے۔ اگرچہ انسان اپنی مادی ارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے اس کے باوجود اخلاقی اور روحانی اعتبار سے تنزلی کا بھی شکار ہے اور یہ ہی ثقافتی اور تہذیبی قدروں کی عمارت کو گرانے میں کامیان ہو رہا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک اور شعر کا منظر نامہ کچھ یوں ہے:

دو طرح کے عیب ہیں اس شہر کی تعمیر میں
جن سے آتی ہے خرابی شہر کی توقیر میں(31)

اس میں منیر نیازی نے" شہری تعمیر' کی ترکیب کو بصری پیکر کے طور پر پیش کیا۔ یہ

ترکیب دراصل ہماری سماعت کو اچھی اور مانوس لگتی ہے۔ انھوں نے 'دو طرح کے عیب' اور 'خرابی شہر کی توقیر' کو علامتی طور پر پیش کیا۔ یہاں شہری زندگی کے عیب اور اس سے پیدا ہونے والی خرابی کا تذکرہ ہے۔ لیکن 'خرابی شہر کی توقیر' کو استعارے کے طور پر پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ اپنی روانی اور رفتار سے مکمل تہذیبی مظاہر کو مسمار کرتا ہوا گزر رہا ہے۔ اور یہی اس شعر کو المیاتی نظریہ ہے۔ اس شعر میں شاعر دراصل انسان اور اس کے عدم ثبات کا ماتم کرتا ہے کہ شہری بناوٹ سے تہذیب کی عمارت مٹ کے زمیں بوس ہو جاتی ہے۔ جبکہ اس صنعتی اور مشینی دور میں انسان اخلاقی اور روحانی قدریں سے عاری ہو کر صرف اور صرف مادی اور جسمانی آرام و آسائش کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔

خیال کتنے ہیں دل میں سمجھ نہیں آتے (32)

اس ایک مصرعے کی نظم میں انھوں نے مختصر اور جامع کہانی کہہ دی۔ دل کے خیالات جس میں ہجرت سے لے کر مکانوں کے ویرانی اور محبت کی داستانوں سے لے کر اُجڑے دیار سب آتے ہیں۔ منیر نیازی نے اپنے شاعرانہ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دل کے احساسات وجذبات کی کہانی چند لفظوں کے ایک مصرعے میں کہہ ڈالی ہے۔ دل میں خیالات کا آنا ایک فطری عمل ہے۔ انسان کے دل میں کبھی بھی کوئی بھی خیال آ سکتا ہے اور اگر کبھی ایسی صورت حال کا سامنا ہوا ہو جیسے منر نیازی کو ہوا تو پھر انسان بہت سے خیالات اور وسوسے دل میں رکھتا ہے:

سائے گھٹتے جاتے ہیں
جنگل کٹتے جاتے ہیں
کوئی سخت وظیفہ ہے
جو ہم رٹتے جاتے ہیں (3 3)

اس شعر میں بھی شاعر زندگی کی ہولناک صورت کو بیان کیا ہے۔ ہم جو زندگی کے سفر میں مسلسل آگے کو بھاگ رہے ہیاور یہ بھولتے جا رہے ہیں کہ ہمارے زندگیاں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کم بھی ہو رہی ہے۔ شاعر نیا پنے پسندیدہ استعارے جنگل کا سہارا لے کر تیز

رفتار زندگی کو پیش کیا ہے۔ ایک چکر ہے جس کے تحت سب چلتے جا رہے ہیں مگر سفر کا مقصد کسی کو بھی یاد نہیں۔

ان کی غزل کے اسلوب کی بات کی جائے تو وہ جدت اور اسلوب سے بھر پور ہے۔ اُنھوں نے جہاں غزل میں فنّی سطح پر تخلیقی قوت آزمائی کی وہی پہ نئے موضوعات و اسالیب کو متعارف کروانے کی سعی بھی کی۔ بیان و بدیع کے حوالے سے ان کی غزل تخلیقی آہنگ، ندرتِ اور تازگی کی حامل ہے۔"علم بیان " میں سب سے پہلے اور اہم تشبیہ کا جزو ہے۔فن تشبیہ میں دو یا دو سے زائد چیزوں میں مشابہت ہونے کا نام ہے جو کسی بھی کلام میں حسن لطافت، شگفتہ بیانی اور انفرادیت کی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔منیر نیازی کی غزل میں پائی جانے والی تشبیہ و استعارہ اُن کی فکری و فنی تخلیقات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اُنھوں نے فکر و فن کے ملاپ سے ایک خوب صورت تخلیقی کام انجام دیا۔اس لیے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں تشبیہات صرف آرائش کا ذریعہ نہیں بلکہ فکری و فنی عمارت کا ایک اہم ستوں بن جاتا ہے۔بالکل اسی طرح یہ اصنافِ فن کے ساتھ معنی و مطالب کی وضاحت کا کام بھی انجام دیتے ہے۔اُن کے ہاں تشبیہ کی جو صورتیں اور اقسام ملتی ہیں۔ان میں کی مثال یہ ہے:

مثال سنگ کھڑا ہے اُسی حسیں کی طرح
مکان کی شکل بھی دیکھو دِل مکیں کی طرح
ملائمت ہے اندھیرے میں اُس کی سانسوں سے
دمک رہی ہیں وہ آنکھیں ہرے نگیں کی طرح
نواحِ قریہ ہے سنسان شامِ سرما میں
کسی قدیم زمانے کی سرزمیں کی طرح (34)

اس میں شاعر نے مکان کو خوبصورتی سے تشبیہ دی ہے کہا گیا ہیکہ مکان کسی پتھر یا چٹان کی طرح کھڑا اپنے مکیں کا انتظار کر رہا ہے۔شاعر محبوب کی سانسوں کی دمک اور آنکھوں کی چمک کو ہرے رنگ سے ملا رہے ہے۔اگلے شعر میں انھوں نے موسمِ سرما کی اُداسی اور ویرانی کو قدیم عہد کی سرزمیں سے جوڑا ہے۔قدیم دور میں جب زیادہ تر علاقے غیر آباد اور

ویران ہوا کرتے تھے۔انسان دولت مادی اشیاء کے بل بوتے پر غرور اور تکبر کرنا،خود کو بہت بڑی قوت سمجھنے لگتا ہے۔وہ اپنی قوتِ بصیرت کے سیاسی تمثل بناتے ہیں جن سے موازنے کا واسطہ بنتا ہو۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

رات کے سنسان گنبد میں رچی ہے راس سی
پہرے داروں کی صدؤں کے طلسمی شور سے
لاکھوں پلکوں کو جھکاؤ، لاکھ گھونگھٹ میں چھپو
سامنا ہو کر رہے گا دل کے موہن چور سے (35)

پہلے شعر میں رات کے سنسان گنبد اور پہرے داروں کے شور کے درمیان تشبیہ کا تعلق بنایا گیا ہے۔جو کہ گہری انسانی بصیرت کو ظاہر کرتے ہے۔ دوسرے شعر میں پلکیں جھکانے اور گھونگھٹ میں چھپنے کو دل کے چور سے تشبیہ کا تعلق ہے۔اس طرح کی مثالوں سے تشبیہ اور موازنے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔اس کی ایک قسم کا تعلق عقل وفہم سے ہے جس میں اس کو فہم وادراک سے طرفین تشبیہ کا اندازہ ہوتا ہے۔منیر نیازی کے یہاں تشبیہ عملی طور پر ایسی صورت میں ملتا ہے۔اسی طرح ان کے یہاں حِسّی و عقلی صورتوں کے ملاپ سے بھی اس کی مختلف اقسام بنتی ہیں۔

منیر نیازی کی غزل گوئی میں تجربات اور اصنافِ ادب فکر وفن کو سنوارتا ہے۔ان کے یہاں تشبیہ کی خوبصورتی کو فنی رو سے ایسے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے کہ کلام حسن کی تاثیر کو بڑھا دیتا ہے۔منیر نیازی کی غزل میں علم بدیع کی ایسی قسم ہے جس سے شاعر نے لفظ اور معنی کے ذریعے فن میں خوبصورتی پیدا کی ہے۔ان کی شاعری میں ان اقسام کو دیکھا جا سکتا ہے جو معنوی اور لفظی لحاظ سے صناع و بدیع کو مناسب طور پر پیش کیا گیا ہو اور جس سے لفظ اور معنی کی پیچیدگیاں پیدا ہونے کی بجائے ہم آہنگی اور آسانی نظر آئے۔اس کے علاوہ ان کے کلام میں طباق، ترصیع، صنعت تجنیس، حُسنِ تعلیل، مراعاۃ النظیر، لف ونشر، اشتقاق، تکرار لفظی، شبہ اشتقاق، تلمیح، تنسیق الصّفات اور ذوقافیتین وغیرہ کا استعمال نمایاں نظر آتا ہے۔ یہاں صنعتوں کے استعمال کے حوالے سے چند ایک شعری زاویے دیکھے جا سکتے ہیں۔

صنعت لف ونشر میں ایسی بات یا چیز کا تذکر کرنا اور پھر ان باتوں یا چیزوں کی مناسبت کو بغیر مخصوص انداز میں بیان کرنا۔لف کا معنی لپیٹنا اور نشر پھیلانے کو کہتے ہے۔اس کی تین اقسام ہے۔مرتّب ،غیر مرتّب اور معکوس الترتیب۔یہاں "لف" اور پھر ایک تسلسل سے "نشر" کو پیش کیا جائے یا پھر اسے بیان کرنے کے لئے لف ونشر کو لف کہہ کر نشر کو مذکور پیش کریں تو یہ لف ونشر مرتّب ہو گا جبکہ لف ونشر غیر مرتّب میں تسلسل اور باقاعدگی کا خیال نہیں رکھا جاتا۔اس کے علاوہ معکوس الترتیب میں ہر حصے کی کا تسلسل اُلٹا ہو جاتا ہے۔منیر نیازی کی غزل سے اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

وحدت سے کثرت کی طرف

کثرت سے وحدت کی طرف (36)

''وحدت'' کی نسبت سے ''کثرت''اور''کثرت'' کی نسبت سے''واحدت'' کی رعایت کو استعمال کیا ہے۔اس شعر کو شاعر نے بڑے ترتیب اور تسلسل سے پیش کیا ہے۔جس میں الفاظ کو اُلٹ کر کیا یسے کہا کہ معنوی لحاظ سے بھی کمی نہ آئے۔منیر نیازی نے شعوری اور لاشعوری طور پر اصناف ادب کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔اسی طرح ایک اور جگہ پر ہے:

جو خبر پہنچی یہاں تک اصل صورت میں نہ تھی

تھی خبر اچھی مگر اہل خبر اچھے نہ تھے (37)

''خبر'' کے لحاظ سے''خبر اچھی''،اور''اصل صورت''سے''اہل خبر'' کی نسبت سے رعایت استعمال ہوئی ہے۔یہاں دیکھا جا سکتا ہے کہ شاعر نے چند الفاظ کے ہیر پھیر سے بات بھی پوری کر لی اور اصنافِ ادب بھی پیش کر دیا۔منیر نیازی کے یہاں ہمیں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

ان کے کلام میں ان کے دل کی آواز ہے۔انھوں نے اپنی قلبی واردات کو سیدھے سادے انداز میں بیان کیا ہے۔کہ ان کا ہر مصرع ،شعر اور لفظ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ان کا کلام تصنع سے پاک ہے سادگی اور برجستگی سے بھرپور ہے۔دوسرے اصناف کی طرح انھوں نے اپنی بات اور مقصد کو قارئین تک پہنچانے کے لیے صنعت تجنیس کو بھی برملا استعمال

کیا ہے۔صنعت تجنیس میں دولفظوں کوایسے استعمال کیا جا تا ہے کہ ادا کرنے میں ملتے جلتے ہو مگر معنی ایک دوسرے کے برعکس ہوں۔صنعت تجنیس کی بہت سی اقسام ہیں۔جس میں تجنیس تام،مرفوع،خطی،مستوفی،مماثل،مرکّب مفروق،مرکّب،محرّف،مذیّل اور مضارع وغیرہ شامل ہیں۔منیر نیازی کے یہاں تجنیس مذیّل، ناقص وزاید اور محرّف کا استعمال واضح ہے۔انھوں نے ان اصناف کو اپنی شاعری کی آرائش اور مفہوم کو بہتر طور پر پیش کرنے کے لئے استعمال کیا ہے:

در بدر نہ میں پھرتا در بدر نہ وہ ہوتا
اک جگہ پہ مل کے جو اپنا در بنا لیتے (38)

اس شعر میں شاعر نے لفظوں کی مہارت سے اصناف کا استعمال کیا ہے۔صنعت تجنیس کو استعمال کرتے ہوئے وہ کہتے ہے کہ اگر ایک جگہ کوئی گھر،کوئی ٹھکانہ بنا لیتے تو یوں در بہ در نہ پھرتے۔کہ انسان کے پاس زندہ رہتے ہوئے کوئی مکان یا رہائش کے لئے ضرور کچھ ہونا چاہیے ورنہ وہ ساری زندگی لاوارثوں کی طرح زندگی گزار دیتا ہے۔ان کے شعر ہیں:

میری بات کے جواب میں
اس نے بھی بات کی
اس کے بات کرنے کے انداز میں
دیر کے گرے ہوئے لوگوں،ڈرادیے گئے شہروں کا عجز تھا
جو پختہ ہو گیا تھا(39)

اس نظم میں منیر نیازی نے خود سے شکوے کا انداز اپنایا جیسے وہ پچھتاوے کا شکار ہے۔وہ کسی عزیز یا پیارے سے ملے ہے مگر دل کا حال نہ پوچھ سکے۔وہ کہتے ہے کہ عام سی باتیں کی گئی اِدھر اُدھر کا احول کہا گیا مگر کسی عزیز سے مل کہ جو دل کی باتیں اور دکھ درد سنائی جاتی ہیں وہ نہ کر سکے۔منیر نیازی کے انداز میں پچھتاوا جھلکتا ہے اور وہ اس بات سے بہت دیر تک اُداس بھی رہے۔منیر نیازی کی غزل میں اس کی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شروع بہار کے ہیں آثار

سبز ہوئے انجیر کے پتے
سبز ہوئی پیپل کی قطار
ہری ہری چلمن کے پیچھے
اُڑتا ہے سُرخی کا غبار
ایک قدیم زمانہ سا ہے(40)

اس میں منیر نیازی نے بہار کے آغاز میں اردگرد کے اثرات کی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہے کہ جو چیزیں خزاں کی ہواؤں سے ویران اور بدحال ہو چکی تھیں وہ بہار میں آمد سے خوشحال ہونے لگ گئی ہیں۔ درختوں کے پتے، پھولوں کی ڈالیاں اور پرندوں کے گیت بہار کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ شاعر نے بہار کے رنگوں کو پیش کیا جو زندگی کی علامت ہے۔ جس طرح موسموں کے اثرات انسان کی نفسیات پر اثر کرتی ہے اسی طرح بہار کا موسم انسانوں کو زندگی پر نئے اور خوشگوار اثرات ڈالتا ہے۔ منیر نیازی کی ایک اور غزل کے شعر دیکھیے:

اب کہاں ہوگا وہ اور ہوگا بھی تو ویسا کہاں
سوچ کر یہ بات جی کچھ اور بوجھل ہو گیا
ٹھنڈی ہوا چلی تو جلیں مشعلیں ہزار
جو غم نظر میں چمکا تھا اب کہکشاں ہوا(41)

پہلے مصرعے میں شاعر نے دوبار "ہوگا" کا استعمال کیا ہے۔ دونوں کے بولنے کا انداز اور معنی مختلف بنتے ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے دو متضاد الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ عام لفظوں کا استعمال کیا جائے تو دیکھا جاتا ہے کہ شاعر نے بڑے سادہ انداز سے کہا ہے کہ دونوں میں کون ہے جو سامنے ہے اور کون ہے جو سامنے نظر نہیں آتا۔ اور جو چھپا ہوا ہے وہ کون ہے۔ شاعر ہوا کے چلنے کو غم کے کہکشاں سے جوڑتا ہے۔ اس میں صنعت تجنیس کے ساتھ صنعت تضاد بھی نظر آتی ہے۔ صنعت تضاد میں دو ایسے الفاظ کا استعمال ملتا ہے جو ایک دوسرے کے مخالف ہوں۔ اسے صنعت تضاد کے علاوہ صنعت طباق بھی کہتے ہے:

دیتی نہیں اماں جو زمین آسماں تو ہے

کہنے کو اپنے دل سے کوئی داستاں تو ہے
یوں تو ہے رنگ زرد مگر ہونٹ لال ہیں
صحرا کی وسعتوں میں کہیں گلستاں تو ہے(42)

ان دیئے گئے اشعار میں یہ الفاظ اور کیفیت "زمیں" اور" آسماں"، "زرد" اور "لال"، "صحرا" اور" گلستاں" متضادا ستعمال کی گئی ہے۔شاعر نے بڑی مہارت سے ان کو بہتر طریقے سے استعمال کیا کہ قارئین ان کی ذومعنی باتیں سمجھ سکے۔صنعت تضاد کی دو اقسام یہ ہیں۔سلبی اور ایجابی۔ایجابی تضاد میں ضد والے الفاظ کو پیش کیا جاتا ہے۔یعنی ایسے دو الفاظ جو ایک دوسرے کے متضاد ہو۔اس کی مثال اوپر والے مصرے میں "زمیں" اور" آسماں"، "صحرا" اور" گلستاں" ہے۔منیر نیازی کے یہاں ایک اور مثال ہے:

قدیم قریوں میں موجود تُو خدائے قدیم
جدید شہروں میں بھی تجھ کو رونما دیکھا
یہ جبر مرگِ مسلسل ہی زندگی ہے منیؔر
جہاں میں اس پہ کبھی اختیار کس کا تھا(43)

اس شعر کے پہلے دومصروں میں شاعر" قدیم و جدید"شہروں کی بات کرتا ہے۔جبکہ دوسرے شعر میں انھوں نے "مرگ اور زندگی"، "جبر اور اختیار" کو استعمال کرتے ہوئے صنعت تضاد کی قسم کو پیش کیا۔شاعر نیان صنعتوں کو صرف اپنے مفاد کے لئے نہیں بلکہ ادب کے معیار کو بھی سامنے رکھتے ہوئے پیش کیا ہے۔دوسری طرف دیکھا جائے تو صنعت تضاد کی دوسری قسم تضاد سلبی ہے جس میں منفی الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے:

ترا ہونا ضروری تھا نہ ہونا بھی ضروری تھا
کسی بھی یاد کا ہستی میں ہونا بھی ضروری تھا (44)

جیسے کہ اوپر شعر میں صنعت تضاد کی دوسری قسم سلبی استعمال کی گئی ہے۔جس میں شاعر "ہونا اور نہ ہونا" کے الفاظ سے تضاد سلبی کی کیفیت پیدا کی ہے۔اس کے بعد منیر نیازی کے کلام میں صنعت مراعاۃ النظیر کو دیکھتے ہے اس صعنت میں ایسی کیفیت پیدا کی جاتی ہے

جس میں متضاد صورت کے علاوہ کوئی مناسبت پائی جائے۔اس کی مثال ہمیں ایسے ملتی ہیکہ دن کے ساتھ روشنی اور سورج، بہار کے ذکر سے سبزا اور پھولوں کے کھلنے کا ذکر ملتا ہے۔اس کو صنعت مواخات، ابتلاف اور تلفیق کہا جاتا ہے۔منیر نیازی کے کلام میں یہ صنعت یوں ملتی ہے:

دلوں میں اب کے برس اتنے وہم کیوں جاگے
بلاد صبر میں اب اضطراب کیوں آیا
ہے آب گل پہ عجب اس بہارِ گزراں میں
چمن میں اب کے گلِ بے حساب کیوں آیا (45)

پہلے شعر میں " وہم اور اضطراب " اور دوسرے شعر میں " آب گل، بہار اور چمن " کی رعایت استعمال ہوئی ہے۔شاعر نے بیان کیا کہ اب جب اتنے برس گزر چکے ہیں اور اب صبر آ جانا چاہیے تو اب کیوں اضطراب اور پریشانی کی کیفیت ہے۔اس نے مزید کہا کہ چمن میں ایسی بہارِ ائی جو اپنے ساتھ گل اب بے حساب لائی۔شاعر کا انداز ایسا ہے کہ جیسے اب چمن میں بہار یا پھولوں کی ضرورت نہیں رہی۔ایسی صعنت کو مراعاۃ النظیر کا نام دیا جاتا ہے۔منیر نیازی کی غزل ملاحظہ ہو:

آج وہ کس دھج سے سیر گلستاں میں محو ہے
چھپ کے اس کے ہاتھ سے وہ پھول چھپنا چاہیے
ابر ہو چھایا ہُوا اور باغ ہو مہکا ہُوا
گود میں گلفام ہو اور پاس مینا چاہیے (46)

درج بالا اشعار میں شاعر گلستان کی سیر میں محو ہونے اور پھول کو چھیننے کی بات کرتے ہے۔وہ ایک خیال، ایک تصور بیان کرتے ہے کہ بادل چھایا ہوا اور باغ مہکا ہو گود میں گل فام اور مینا پاس ہو۔شاعر نے ایک بہترین رومانی تصور پیش کیا ہے۔باغ ہو اور موسم بھی خوبصورت ہوا اور ایسے میں گنگھنانے کے لیے مینا بھی ہو تو ایک شاعر کے لیے اس سے زیادہ پُرسکون اور کیا ہوسکتا ہے۔منیر نیازی کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں جس میں اُجڑی بستیوں اور اُمتوں کو یاد کر رہے ہے:

سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں
اُن اُمتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں
کر یاد اُن دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں (47)

پہلی مثال میں اُجڑی بستیاں اور اور راستوں میں مرنے والے اُمتوں کا تذکرہ ہے شاعر پرانے اور خوش حال دنوں کو یاد کرتے ہے۔ایک غم کی داستان بیان کی گئی ہے۔خوش حالی سے بدحالی کا سفر کیسے طے ہوا جیسے آباد گلیاں وایرن ہوئی، کیسے پھولوں کی جگہ خون نے لے لی۔ ہستابستا گلستان تباہی کا شکار ہو گیا۔منیر نیازی نے شعر میں غم اور خوشی کا تذکرہ ایک ساتھ کیا ہے۔

علم بدیع میں حُسنِ تعلیل ایک ایسی صنعت ہے جو کلام میں تازگی پیدا کرتی ہے۔یعنی کسی کام کے لئے ایسی بات یا وجہ پیش کرنا جو دراصل حقیقت نہ ہو بلکہ حقیقت کچھ اور ہو۔منیر نیازی کے یہاں ہمیں اس کا استعمال ملتا ہے۔جیسا کہ:

شہر نا معلوم کی جادو گری کچھ کم ہوئی
اس سفر میں شوق کی دیوانگی کچھ کم ہوئی
حُسن جو دیکھا نہیں تھا اُس کو دیکھا سامنے
صبح و شام زندگی میں اک کمی کچھ کم ہوئی (48)

شاعر نے پہلے شعر میں نا معلوم شہر کی جادوگری اور شوق کی دیوانگی کی بات کی ہے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ نا معلوم شہر ہے اور پھر اسے جادوگری کہا۔شاعر اگلے شعر میں حسن کو دیکھنے یا پھر یوں کہیے کہ شاعر محبوب کو نہ دیکھنے کی جو کمی محسوس کرتا ہے اس کی یہ خواہش اور دلی مراد پوری ہوئی۔ جسے شاعر نے آخری مصرعے میں کہا کہ صبح شام جو کمی محسوس ہوتی تھی اب اس میں فاقہ ہے۔شاعر کا انداز نزاکتِ اور ندرت بیان کسے بھرپور ہے۔اس میں شاعر نے حسن تعلیل سے کام لیا ہے۔منیر نیازی کے یہاں علم بدیع کی وسیع اقسام ملتی ہے۔

صنعت اشتقاق میں ایسے دو الفاظ کا استعمال جن کا ماخذ ایک سا ہو اور معنی کے اعتبار سے بھی متفق ہوں۔جیسے گل، گلزار وغیرہ۔منیر نیازی کے ہاں اس صنعت کو ایسے پیش کیا گیا ہے۔

عجب رنگ رنگیں قباؤں میں تھے
دل و جان جیسے بلاؤں میں تھے (49)

اب دیکھیے یہاں شاعر نے ''رنگ'' اور "رنگیں'' کا ماخذ ایک ہے اور اسی سے یہ دونوں الفاظ بنے ہیں۔ اب آگے شعر میں الفاظ کو ایک نئے رنگ سے پیش کیا ہے۔ پہلے مصرعے میں بے حسی دعا دے رہی ہے جبکہ اگلے مصرعے میں بے دلی کی دعا کو موضوع بنایا گیا ہے۔مختصر یہ کہ شاعر نے چند الفاظ کو بدل کے بات کے مفہوم کو بدل دیا ہے:

بہت دعائیں بھی دیتی ہے بے حسی دل کو
بہت دعائیں بھی ہوتی ہیں بے دلی کی دعا (50)

کسی بھی کلام اعداد وشمار کا تذکرہ ہوتو اُسے صنعتِ سیاق الاعداد کہا جاتا ہے اور منیر نیازی نے اس صنعت کو بھی اپنے کلام کی خوبصورتی اور گہری وسعت کے لیے استعمال کیا ہے:

آدھا چہرہ روشنی میں ہے آدھا کالے پردے میں
ایک آنکھ ہے سورج جیسی ایک ہے کالے پردے میں

بھید نہ اب تک باہر آیا آدھے گرے نقابوں سے
آنکھ ہمیشہ گھری رہی ظاہر اور چھپے سرابوں سے (51)

پہلے مصرعے میں شاعر نے لفظ " آدھا" اور اگلے مصرعے میں "ایک" کا استعمال کیا ہے۔ جبکہ دوسر شعر میں بھی " آدھ " کا عدد کا استعمال کیا ہے۔

ہیں رونقیں بھی محفل یاران شہر میں
قصرِ بتاں میں حسن کی آرائشیں بھی ہیں (52)

اس شعر میں شاعر نے حسن کی آرائش اور یاروں کی محفل کو موضوع بنایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یاروں کے ہونے سے شہر کی محفلیں اور رونقیں آباد ہیں۔منیر نیازی کے یہاں شہر کا استعارہ اکثر منفی رہا ہےوہ شہروں کو ویرانی اور اُجڑے دیار سے جوڑتے ہے۔ وہ شہر کے شور وغل کے لئے اچھے تاثر نہیں رکھتے مگر کہی کہی اس کا مثبت استعمال بھی ملتا ہے۔ چند ایک جگہوں پر شہر

کو مثبت معنی میں استعمال کیا ہے:

کیسے خواب میں آنکھیں کھولیں
کیسے بن کو دیکھا
من میں او جھل کوئل بولی
کیسے تن کو دیکھا(53)

یہاں شاعر خواب دیکھنے بات کرر ہا ہے۔خواب بہت سی خواہشوں اور اُمیدوں کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ انسان خوبصورت زندگی کا خواب دیکھتا ہے آزاد فضا کا خواب، کامیابی کا خواب اور ان خوابوں کے لئے وہ سخت محنت کرتا ہے۔شاعر دوسرے شعر میں کہتا ہے کہ ایسے خوابوں پر من کوئل یعنی دل کی دھڑکن کہتی ہے کہ کیسا خواب دیکھا ہے:

جس میں مَیں رہتا نہیں جس میں کوئی رہتا نہیں
جس میں کوئی دن نہیں ہے رات کا پہرا نہیں (54)

موسیقی اور ترنم کی بات کی جائے تو منیر نیازی کے یہاں اس سلسلے میں بھی نمایاں کام ملتا ہے۔ان کی اکثر غزلوں اور نظموں میں ترنم پایا جاتا ہے۔لفظوں کا تکرار اور روانی بھی ان کی شاعری میں ترنم کی فضا پیدا کرتے ہے۔انھوں نے قافیہ اور ردیف کا بہت خیال رکھ ہے۔ان کی بہت سی غزلیں اور نظمیں آسانی سے گھنگھنائی جاسکتی ہیں۔منیر نیازی کے کلام کی یہ بڑی خوبی ہے کہ جہاں اور بہت سی ادبی اصناف کا استعمال آسانی سے مل جاتا ہے وہاں ترنم اور قافیہ ردیف بھی آسانی سے پایا جاتا ہے۔جیسے اگلے شعر میں ہے:

ابر و ہوا نئے نئے، شمس و قمر نئے نئے
اہلِ نظر نئے نئے، اہلِ خبر نئے نئے(55)

اس طرح یہاں الفاظ کا تکرار ترنم کی آواز پیدا کر رہا ہے جو نہ صرف اشعار کو خوبصورت بنا رہے ہیں بلکہ معنی و مطالب سے بھی بھر پور ہے۔منیر نیازی کے یہاں شاعری صرف الفاظ نہیں بلکہ احساس اور جذبات کی زبان ہے۔ ہر شاعر کی طرح انھوں نے بھی اپنی خوشیاں، تکلیفوں، اپنے دکھ، سکھ اپنی زندگی کیجساس موضوعات پہ بے دھڑک لکھا۔ان کا کلام

ہر طرح کے احساس سے بھرپور ملتا ہے۔ جہاں منیر نیازی نے اردو شاعری سے اپنے خیالات کا اظہار کیا وہی انھوں نے پنجابی شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔ بانو قدسیہ ان کی پنجابی شاعری کے حوالے سے اپنے خیالات اس طرح بیان کرتی ہے:

"اصل وچ منیر نیازی دی شاعری ایک رت اے یک ساں اے اک شہر تے اک شہر وچ وسن والی مٹیار تے اوہدا بیلی شاعر آپ اے جیہڑا رت تے سمے شیشہ اپنیاں تانگاں دے سورج اگے پھرت دے دے کے لشکاے ماردا اے۔ اسیں تر بک تر بک جانے آں ایدھر اودھر ویکھنے آں پر سانوں ادھ آسماناں تیکر سر چ لیناں جنیاں دی دسدیاں نہیں۔ نہ توپ لبھ دی اے ناں ہوائی جہاز!" (56)

انھوں نے پنجابی شاعری میں بھی وہی پیغام ارساں کرنے کی کوشش کی ہے جو اردو شاعری کے لیے کی ہے۔ انہی موضوعات کو مرکز بنایا جو انسانی تہذیب اور اعلی اقدار کے پاسدار رہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے اردو تراجم بھی کیے جوان کے اردو شاعری کے مجموعوں میں پائے جاتے ہے۔ ان کی نظم کے یہ اشعار جو بہت مشہور ہے:

کجھ انج وی راہواں اوکھیاں سن
کجھ گل وچ غم دا طوق وی سی
کجھ شہر دے لوک وی ظالم سن
کجھ منیوں مرن دا شوق وی سی (57)

" سفر دی رات " میں سے لیے گئے یہ اشعار شاعر کے تخیل کی منظر کشی کرتی ہے۔ وہ کہتے ہے کہ راستے تو مشکل تھے مگر ہم نے خود ایسے راستوں کا انتخاب کیا۔ شائد مشکل راستہ چننے کا مقصد وہ غم اور دکھ ہے جو وہ دل میں پال کے بیٹھے ہے۔ شاعر اس سے آگے کہتے ہے کہ شہر کے لوگ ظالم تھے وہ خود بھی زندگی سے کچھ زیادہ خوش نہ تھا سو اس لئے بھی ایسا انتخاب کیا جو موت کی طرف لے جائے۔ انھوں نے تخلیقی انداز سے جدید شہری زندگی اور ان لوگوں کے اوصاف بیان کیے ہے۔ جیسے ان کی اردو شاعری میں " شہر " ایک اہم ترین استعارہ ہے ویسے

ہی پنجابی شاعری میں بھی شہری زندگی اور اس سے جڑی چیزیں اہم استعارے ہیں۔ان کی شاعری کو کسی فارمولیا قاعدے قانون کے تحت نہیں پرکھا جا سکتا کیونکہ ان کے یہاں ایک ہی رجحان میں کئی اقسام ملتی ہیں۔جیسے وہ جنگل کو کئی طرح سے پیش کرتے ہیاور یہ ہی جب ان کی تخلیقی قلم سے نکلتے ہیں تو یہ ایک نئے رنگ اور نئی صورت میں سامنے آتا ہے۔ان کے یہاں حقیقت پسندی بھی ہےاور داخلی وخارجی کیفیات کا اظہار بھی ہے۔اس حوالے سے صفدر میر لکھتے ہے:

" اوہدے جذبات دا ہڑھ اوہدا اکلاپا اے۔ جیہڑا اوہنے سکولاں کالجاں وچ نہیں پڑھیا۔۔۔۔۔نہ اوہ روایتی غزل دی محبت سے نفرت اے تے نال اج دے وڈے ستراں دے شاعراں دی دل ہور منہ ہور قسم دی منافقت دی پال ہوئی محبت تے نفرت اے۔۔۔۔۔۔۔اے اکلاپا اج دے وڈے ہردے شاعر دا روندا کرلاندا ہوئیا آپ سیاپا ئیں۔اک بہادر دی موت والا اکلاپا اے جیہڑا اپنے ساریاں دشمنیاں نوں مار کے تے اپنے ساریاں ساتھیاں نوں مروا کے تے اپنے سینے وچ تیر کھا کے وی اکلا پتھر وانگ کھلوتا رہندا اے۔ایہ گل منیر نیازی دی شخصیت دی اصل وی سے تے اوہدی شاعری دی تحریک اے ایہ اوسدیاں نظماں وچ جاری سارے خوف دا سرچشمہ ہیتو اوہدی تخلیقی قوت پشت پناہ وی اے"(58)

ان کی کتاب " چار چپ چیزاں " جب منظرِ عام پہ آئی تو اسے کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔اس کتاب میں شاعر کے بنیادی موضوع میں تنہائی اور اکیلا پن نمایاں ہیں۔ویران اور اجڑی ہوئی بستیوں کی دہشت کو علامتی طور پر استعمال کیا ہے۔انھوں نے شہر کی ہولناک اور تنہائی کے شکار انسانوں کو نمایاں کرنے کے لیے مختلف صورتیں پیدا کی۔منیر نیازی کہتے ہے کہ جو انسان مادی چمک دمک میں گم ہو جاتا ہے وہ انسان اپنے اصل جوہر سے محروم ہو جاتا ہے۔وہ کہتے ہے کہ یہ کسی آسیب کا سایہ ہے۔درج ذیل اسی پس منظر میں ہے۔

یار مرے بھلا کون اے ایتھے بحر زمین پہاڑ

اساں کسے دن سرے مل کے کراں گے اویلغار
ساڈے ای ورگا چپ اسمان وی جائے گا ساتھیوں ہار
وانگ ورولیاں اڈدا پھرے گا(59)

منیر نیازی کے کلام کی سادگی ہی اصل خوبصورتی ہے۔ان کے یہاں ہمیں شاعری زندگی مسائل کوسچائی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔انھوں نے انسان کی عظمت اور کردار کی مضبوطی کو اہمیت دی۔اپنے کلام میں وہ معاشرتی برائی اور ناانصافیاں کو مخاطب کرتے نظر آئے۔ان کی اپنے دائرِ یا سلوب میں مضبوط گرفت نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں حقیقت پسندانہ رنگ اور زندگی کی کڑواہٹ کی چھاپ نمایاں ملتی ہے۔فیض احمد فیض نے منیر نیازی کے اس انداز کو بہت سراہا۔اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"زبان واظہار کی سادگی و پرکاری جذبات وافکار کا خلوص اور دردمندی منیر کی ذات کی طرح ان ابیات میں قلندرانہ طنطنہ اور بے نیازی بھی ہے مفکرانہ تجسس بھی اور دلسوزی بھی پنجابی منظومات کا اردو میں ترجمہ ایک دلچسپ اضافہ ہے جس کے لیے غیر پنجابی شائقین منیر کے شکر گزار ہوں گے اور اس مجموعے کے مطالعے کے قارئین کو میرے سے کوئی شکایت پیدا ہوگی تو غالباً یہی کہ کتاب اس قدر مختصر کیوں ہے"(60)

منؔیر نیازی کی شخصیت میں سیاسی،سماجی،مذہبی اور تاریخی شعور اور آگاہی موجود تھی۔ان کے کلام میں شعور واضح اور نمایاں دکھائی دیتا ہے۔وہ نڈر،بے باک اور بہادر انسان تھے حق اور سچ کہنے میں انھیں ڈر یا جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔معاشرے میں جس چیز کو وہ برا اور ناانصافی پر دیکھتے اُس کو برملا ڈھنکے کی چوٹ پر بُرا کہنے میں عار محسوس نہ کرتے۔اُن کے کلام میں حق وصداقت کی مثالیں واضح ملتی ہیں۔اپنی اکثر غزلوں میں زمین کے جابر اور ظالم نظام کو بدلنے کا ارادہ رکھتے ہے اور اسی کی اصلاح میں گم نظر آتے ہے۔ان کی نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے موضوعات کے لئے اپنے ماحول اور اپنے لوگوں سے مدد لی۔انھوں نے جنگل،چڑیل،تنہائی،سانپ اور چیل جیسے استعارے،

علامتی اسلوب بیاں اور شاعرانہ جملوں کو استعمال کرتے ہوئیموجودہ دور کے انسان کی داخلی و خارجی کرب کا اظہار کیا ہے۔

منیر نیازی آزادی کے لئے ہر قسم کی پابندی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے نظر آئے۔ان کی تخلیقی صلاحیت اور گہرا مشاہدہ نے ان کی ذات میں گھٹن پیدا نہ ہونے دی۔ان کی شاعری کی خیالات کی گہرائی اور موضوعات پر مضبوط گرفت حاصل کرنے کے لیے ان کی شخصیت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ان کے کلام کے الفاظ،مصرعے اور اشعار پڑھنے اور سننے والوں کو دیر تک یاد رہ جاتے ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں زندگی کی حقیقتوں سے کام لیتے ہوئے انسان کی مختلف کیفیات پر قلم اُٹھانے کی سعی کی ہے۔وہ اپنی شاعری کے انتخاب میں سنجیدہ رہے۔انھوں نے اپنے اردگرد حالات و واقعات اور اپنی قلبی صورت حال کو بیان کرنے کے لیےشاعری کو استعمال کیا۔ وہ نرم الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے محبت، سیاست، معاشرت، آزادی اور تنہائی جیسے موضوعات پر لکھتے نظر آتے۔جب انھوں نے سیاست پر قلم اُٹھایا تو ہر اس انسان کے حق میں آواز بلند کی جو ظالم حکمران کا شکار ہوا۔

منیر نیازی نے جب ہجرت کو موضوع بنایا تو انھوں نے ہر اس خواب کو لکھا جو مہاجرین اپنے ساتھ لائے تھے۔وہ خود بھی ہجرت کر کے انڈیا سے پاکستان آئے تھے وہ ان احساسات اور جذبات کو بیان کرتے ہوئے ان قربانیوں اور تکلیفوں کو بھی لکھتے جو مہاجرین کے حصے میں آئیں۔انھوں نے جب محبت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تو انھوں نے ہر عاشق کی طرح اپنے الفاظ کو جذبات کی شدت میں لپیٹ کر محبوب کے گرد گھومائے۔ جب ان کے کلام میں اصناف ادب کو پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ایک طالب علم کے لئے یہ بہت حیران کن بات ہے کہ انھوں نے صرف شاعری نہیں کی بلکہ صنایع وبدیع کا خیال بھی رکھا ہے۔ان کے الفاظ میں ایسا طلسم ہے جو قارئین کے کانوں سے ٹکرا کر دل میں اُتر جاتا ہے۔ان کے یہاں الفاظ کا انتخاب بہت نفاست اور سوچ سمجھ کے کیا گیا تا کہ ان کی بات پوری معنی کے ساتھ پڑھنے والوں تک پہنچ جائے۔اُنھوں نے اپنے کلام کو پیش کرنے کے لئے مشکل الفاظ یا تراکیب کا استعمال نہیں کیا اور نہ ہی کوئی عجیب فلسفہ پیش کیا ہے بلکہ ان کے یہاں انداز ایسا سادہ اور صاف ہے کہ عام سے عام طالب علم ان کے کلام سے استفادہ حاصل کرسکتا ہے۔ان

کے یہاں جنگل اور وسوسوں کے استعارے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ان کی شاعری پڑھتے ہوئے قارئین جنگل کا سفر بھی کر لیتے ہیں۔اس نے مختلف پہلوؤں سے معاشرے کی اصلاح کے لئے کوشش کی۔انھوں نے بہت دھیمے لہجے میں اپنے دکھ اور خوشیاں بیان کی ہے۔وہ حقیقت پسند رومانوی شاعر ہے۔

منیر نیازی کی نظموں اور غزلوں میں تنہائی اور اکیلے پن کا احساس نمایاں ہے اور اس احساس کو پیش کرنے کے لئے انھوں نے قدرتی مناظر، جنگل، چاند ستارے، بلند و بالا پیڑوں، شہروں کا شور اور پکے مکانوں کی ویرانی جیسے استعارے استعمال کیے۔وہ شام کا مسافر ہے اور اس نے ماضی سے مستقبل کی راہ پہچانی۔ان کی شاعری اپنے دور کے لوگوں کی چلتی پھرتی شکل ہے۔ان کے یہاں انسان کے وقار اور سر بلندی کو اولین ترجیح حاصل رہی اور وہ کلام میں عدل وانصاف کی آرزومندرہے۔انھوں نے معاشرے کے منفی رجحانات کو مخاطب کر کے اصلاح کی کوشش کی۔انھوں نے اپنے اسلوب بیاں تلخ حقیقتوں کو مخاطب کیا۔انھوں نے اردو شاعری میں روایتی انداز کو اپنانے کے ساتھ اس میں جدت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے تخلیقی مزاج میں نظم اور غزل کی خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔انھوں نے سادہ الفاظ کے ساتھ ترکیب سازی پر توجہ مرکوز کی۔

وہ کسی ادبی رجحان یا تحریک کا حصہ نہیں رہے۔ان کے شاعری میں ارد گرد کے ماحول کے اثرات تو نظر آتے ہے مگر ساتھ ان کی باطنی کشمکش بھی نظر آتی ہے۔ بحثیت مجموعی اگر ہم منیر نیازی کے فن پر نظر ڈالیں تو یہ نکات سامنے آتے ہیں۔کہ انھوں نے نظم اور غزل کی ایک معنویت کو ہمہ جہت بنایا۔علامتوں کے ذریعے گہرے اور پیچیدہ معانی و مفاہم پیش کیے۔ حقیقت نگاری اور تخیلاتی دنیا کا سہارا لے کر زمان و مکاں کے فاصلے مٹانے کی کوشش کی ہے۔ فن،فکر،اسلوب،ہئیت اور شعری اصناف کو استعمال کرتے ہوئے اپنی بات قارئین تک پہنچائی ہے۔اپنی شخصیت کے الجھاؤ کو سلجھانے، احساس اور شعور کی تلاش میں طویل منازل طے کیے۔ان کے ہاں انفرادیت اور خود پسندی کا رجحان ملتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔منیر نیازی، تیز ہوا اور تنہا پھول، گورا پبلی کیشنز، لاہور، 1994، ص:6

۲۔فدا احمد کاردار،منیر نیازی سے ملاقات ہفت روزہ اخبار جہاں، کراچی، 22 تا 29 فروری 1976ء

۳۔منیر نیازی، سفید دن کی ہوا اور سیاہ شب کا سمندر، گورا پبلی کیشنز، لاہور، 1996، ص:28

۴۔منیر نیازی، پہلی بات ہی آخری تھی، خزینہ علم و ادب، لاہور، ص:25

۵۔منیر نیازی، ماہ منیر، خزینہ علم و ادب، لاہور، 1988ء، ص:23

۶۔منیر نیازی، جنگل میں دھنک، ماورا پبلی کیشنز، لاہور، 1993، ص:111

۷۔نفیس اقبال، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو گیت نگاری، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1986ء، ص:301

۸۔منیر نیازی، چھ رنگین دروازے، خزینہ علم و ادب الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور، 1979ء، ص:29

۹۔ڈاکٹر نجمہ خان، "منیر نیازی، اپنی شاعری کے آئینے میں" مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ 19، ص 300-301

۱۰۔منیر نیازی، جنگل میں دھنک، ایضاء، ص:86

۱۱۔منیر نیازی، تیز ہوا اور تنہا پھول، ایضا، ص:90

۱۲۔شبلی فاروقی، پاکستان میں گیت کے امکانات، مشمولہ آئندہ، کراچی، پاکستانی ادب نمبر، جلد 11، شمارہ 41، جنوری تا مارچ 2006، ص:117

۱۳۔http://www.urdupoint.com,husnainseherinterivews

۱۴۔منیر نیازی، چھ رنگین دروازے، محولہ بالا، ص:15

۱۵۔منیر نیازی، جنگل میں دھنک، محولہ بالا، ص:19

۱۶۔منیر نیازی، تیز ہوا اور تنہا پھول، محولہ بالا، ص:40

۱۷۔منیر نیازی، دشمنوں کے درمیان شام،محولہ بالا،ص:54

۱۸۔ایضا،ص:2

۱۹۔منیر نیازی، چھ رنگیں دروازے،محولہ بالا،ص:30

۲۰۔منیر نیازی، ایک دعا جو میں بھول گیا،خزینہ علم وادب، لاہور،ص:40

۲۱۔منیر نیازی،سفید دن کی ہوااور سیاہ شب کا سمندر،محولہ بالا،ص: 131

۲۲۔ایضاً،ص:15

۲۳۔منیر نیازی، آغازِ زمستان میں دوبارہ،خزینہ علم وادب، لاہور، 1981ء،ص:24

۲۴۔منیر نیازی، جنگل میں دھنک، گورا پبلی کیشنز، لاہور، 1997ص:7

۲۵۔ایضا،ص:44

۲۶۔منیر نیازی، دشمنوں کے درمیان شام،محولہ بالا،ص:60

۲۷۔ایضا،ص:82

۲۸۔منیر نیازی، پہلی بات ہی آخری تھی،خزینہ علم،محولہ بالا،ص:47

۲۹۔سعادت سعید، بے خوابی کے خوابوں کا شاعر۔منیر نیازی معاصر،ص:503

۳۰۔منیر نیازی،سفید دن کی ہوااور سیاہ شب کا سمندر،محولہ بالا،ص:19

۳۱۔منیر نیازی، ایک دعا جو میں بھول گیا،محولہ بالا،ص:60

۳۲۔منیر نیازی،سفید دن کی ہوااور سیاہ شب کا سمندر،محولہ،ص:18

۳۳۔منیر نیازی، پہلی بات ہی آخری تھی،محولہ بالا،ص:39

۳۴۔منیر نیازی، ماہ منیر،محولہ بالا،ص:81

۳۵۔منیر نیازی، جنگل میں دھنک،محولہ بالا،ص:87

۳۶۔منیر نیازی، چھ رنگیں دروازے،محولہ بالا،ص:56

۳۷۔منیر نیازی، ایک دعا جو میں بھول گیا،محولہ بالا،ص:40

۳۸۔منیر نیازی، آغازِ زمستان میں دوبارہ،محولہ بالا،ص:42

۳۹۔منیر نیازی، کلیات منیر، ماورا پبلی کیشنز، لاہور، 1986ء،ص:78

۴۰۔ایضا،ص:23
۴۱۔منیر نیازی، جنگل میں دھنک، محولہ بالا، ص:93
۴۲۔ایضا، ص:25
۴۳۔ایضا، ص:55
۴۴۔منیر نیازی، سفید دن کی ہوا اور سیاہ شب کا سمندر، محولہ بالا، ص: 33
۴۵۔ایضا، ص:45
۴۶۔منیر نیازی، جنگل میں دھنک، محولہ بالا، ص:83
۴۷۔منیر نیازی، دشمنوں کے درمیان شام، محولہ بالا، ص:65
۴۸۔منیر نیازی، پہلی بات ہی آخری تھی، محولہ بالا، ص:19
۴۹۔ایضاً
۵۰۔ایضاً
۵۱۔منیر نیازی، دشمنوں کے درمیان شام، محولہ بالا، ص:37
۵۲۔منیر نیازی، ساعت سیار، محولہ بالا، ص:25
۵۳۔ایضا، ص:34
۵۴۔ایضا۔ص:67
۵۵۔منیر نیازی، کلیات منیر، محولہ بالا، ص:69
۵۶۔امجد جمیل، پاکستانی ادب کے معمار منیر نیازی شخصیت وفن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2006ء ص:92
۵۷۔ایضا، ص:96
۵۸۔ایضا، ص:99
۵۹۔ایضا، ص:98
۶۰۔فیض احمد فیض، دیباچہ، مشمولہ: ساعت سیار (منیر نیازی)، محولہ بالا، ص:9

☆☆☆☆☆☆

پی۔بی شیلے کی شاعری

(فکری وفنی مطالعہ)

شیلے کی شاعری میں فطرت سے محبت، اداسی، تخیل، مافوق الفطرت اور مثالیت ہے۔ ان کی شاعری میں غزل اور گیت کی خوبیاں ہیں۔ انگریزی ادب میں ان کو رومانی شاعر مانا جاتا ہے۔ رومانی شعراء کے اہم موضوعات میں بے چینی اور حوصلہ افزائی، اختیارات کے خلاف بغاوت اور آزادی کی تلاش شامل ہیں۔ شیلے سماجی شعور کے راستے زندگی کے اعلیٰ اقدار کو اُجاگر کرتا ہے۔ شیلے شاعرانہ مزاج رکھنے والا شخص ہے جس کے پاس خاص قابلیت نہیں اور نہ ہی اس نے طویل نظمیں لکھی۔ ان کے خیال میں رومانوی طرز احساس فکری ارتقاء کی پہلی سیڑھی ہے۔ انیسویں صدی میں شیلے کو ناقدین نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ جبکہ وکٹورین دور میں ان کو مثالی محبت کا شاعر مانتے ہوئے رومانوی شاعر کہا جانے لگا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پھر ایک دفعہ ان کی شاعری بے توجہی کا شکار ہوئی جبکہ تیس کی دہائی میں دوبارہ ان کی فکری وفنی منظر کشی، گہری فلسفیانہ سوچ اور جذباتی پختگی نے تنقید کے میدان میں اپنی جگہ بنائی۔ بورا نے ان کو شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے اعلیٰ درجے کے فلسفی شعراء میں شمار کیا۔ کچھ ناقدین ان کو منطق دان کہتے ہیں ان کے خیال میں شیلے نے اپنی ذات کے ساتھ سماجی وسیاسی افکار کو بھی پیش کیا۔ ان کی شاعری کے کئی پہلو ہیں۔

شیلے نے اپنے مضمون "شاعر کا دفاع" میں دلیل دیتے ہوئے کہا کہ شاعر ایک تخلیق کار ہے۔ وہ تخلیقی تخیل کو حقائق اور فطرت کے درمیان روشنی کے ماحول کو سامنے لا کر امتزاج ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی شاعری کسی خوبصورت آواز والے پرندے کی طرح ہے ان کا انقلابی آئیڈیلزم فرانس میں ہونے والے انقلاب کا نتیجہ ہے۔ اس نے محبت کو لامحدود اور خوبصورتی کو عقل کا نام دیا۔ شیلے کے خیال میں محبت اور خوبصورتی انسان کے خیالی اور ذہنی عناصر ہیں۔ اپنی مجلس میں، وہ محبت کو تحفظ اور تخلیق کا جز وقرار دیتے۔

شیلے کی شخصیت میں سیاسی ،سماجی ، مذہبی اور تاریخی شعور اورآ گاہی موجود تھی۔ان کے کلام میں شعورواضح اورنمایاں دکھائی دیتا ہے۔معاشرے میں جس چیز کووہ برااورناانصافی پر دیکھتے اُس کو برمِلا کہہ دیتا۔اُن کے کلام میں حق وصداقت مثالیں کی واضح ملتی ہے۔ان کے یہاں جابراور ظالم نظام کو بدلنے کاارادہ ملتاہے۔اپنی نظم " حیمن ٹوانٹلیکچوئل بیوٹی" میں وہ خوبصورتی کواعلیٰ روح کےطور پرعزت دیتاہے۔ شیلے کا لہجہ رومانوی ہے۔انھوں نے بصری معنوں میں بہت طاقتور امیجری اور علامت نگاری کا استعمال کرتا ہے۔"دی اسکائی لارک"، "حیمن ٹوانٹلیکچوئل بیوٹی"اور" میوزک وین سوفٹ وائس ڈائی"وغیرہ میں جوتشبیہات اورتخلیقی قوت استعمال کی گئی ہے وہ اس کے شاعرانہ جذبے کوظاہر کرتی ہے۔ان کے یہاں آرائشی الفاظ کااستعمال کم ہی ملتاہے۔انھوں نے موسیقی کی آوازوں کااستعمال کرتیہوئے جذبات کو ہرایک کے کانوں تک پہنچایا۔ان کی نظم "اوڈ ٹو دی ونڈ" میں ان کی تخلیقات کی مثال ملتی ہے۔ رومانوی شاعروں میں شیلے کے پاس وہ خوشی، عاجزی، انسانیت میں اعتماد، اورامید ہے جس نے انہیں انیسویں صدی کے اہم انگریزی ادیبوں میں سے ایک بنا دیا۔ شیلے کے پاس ذہانت کاوہ معیارتھا جوزبان کوبہتر استعمال کرنے کی صلاحیت،سائنسی تصورات اور دریافتوں کوسمجھنےاوران کااطلاق کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔شاعرحقیقت کی تلخیوں کی بات تو کرتا ہے مگرساتھ ہی اُمید کادامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا:

> " شیلے خیالوں کی دنیا میں حقیقت سے ٹکرا کرٹھوکریں کھاتا رہتا
> ہےلیکن کبھی وہ اپنے عزم کو مایوسی کے حوالےنہیں کرتا۔وہ اپنی
> ذاتی زندگی میں قنوطیت کو داخل کرسکتا ہےلیکن بحثیت پیغامبر
> سارے غم کو بھلا بیٹھتاہے" (1)

یونانی مفکرین نے شاعری کودوحصوں میں تقسیم کیا۔ان میں اک کونغمہ یا گیت کانام دیا گیا جبکہ دسری قسم میں ساز پر رقص کرتے ہوئے گائی جائے۔ گیت نگاری میں شاعری کی داخلی کیفیات کونظم میں ڈھالا جاتاہے۔اس میں خاص جذبات کااظہار کیا جاتاہے۔انگریزی ادب میں بہت سے شعراء نےنغمات لکھےجن میں شیلے کانام بھی آتاہے۔ان کے شعروں میں

نغموں کا رنگ بھرپور ہے اور یہ خوبی ان ایک شاعر کی حیثیت سے نمایاں کرتی ہے۔ گیت نگاری یا موسیقی تمام دھنوں کا لازمی جزو ہے، ان کی شاعری میں میٹھاس اور ہم آہنگی ہے۔ "میوزک وین سوفٹ وائس ڈائی" "لو فلاسفی" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کی شاعری پھول کی خوشبو کی طرح ہے۔ ان کے نقاد بھی ان کے گیتوں کی تعریف کیے بغیر رہ نہ سکے۔ نرم الفاظ کانوں میں گھل کر دل میں اُتر جاتے۔ ان کے گیتوں میں ان کی تخلیقی صلاحیت نظر آتی ہے۔ اپنے عہد کے بہترین شعراء اور گیت نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی نظموں میں ترنم کی خوبی اور پُراسرار طلسم ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں تخریبی اور تعمیری عنصر پایا جاتا ہے۔ ان کے گیتوں اور نغموں میں استعمال ہونے والے استعارے گہرائی اور تاثیر کی شدت میں اضافہ کرتے ہے:

جب ہوتا ہے موسم میں بہاروں کا ترشح
اک نغمہ ابھر جاتا ہے خاموش فضا میں
سبزوں پر چمکتی ہوئی پانی کی یہ بوندیں
پھولوں کے تبسم کو بنا دیتی ہیں رنگیں (2)

یہاں شیلے موسمِ بہار کے گیتوں کی بات کرتا ہے۔ کہ بہار کی آمد سے خاموش لبوں پر نغمے اُمڈ آتے ہیں۔ زمیں جب سبز لباس اُڑتی ہے تو شبنم کی بوندیں موتی کی طرح دیکھائی دیتی ہیں اور وہی شبنم جب پھول پر برستی ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ پھول مسکرا رہے ہیں۔ بہار پھول کھلنے کا موسم ہے۔ زمین اپنا رنگ بدلتی ہیاور مردہ زمین سے نئ زندگی جنم لیتی ہے۔ بہار زندگی اور سکون کی علامت ہے۔ اسی موسم میں پرندے بھی گیت گاتے اور جشن مناتے ہیں۔ یہ ہی وہ موسم ہے جب شاعر فطرت کے بدلتے رنگ دیکھتا اور اُمید کو اپنی ہتھیلی پہ سجا کہ آگے بڑھنے کا عزم کرتا ہے۔ اس موسم میں شاعر پھولوں کے رنگوں کو تبسم کہتا ہے۔ اسی موسم میں قدرت کے خوبصورت مناظر تازہ ہوا میں جادو کے نغمے گاتے ہیں۔ یہ موسم شاعروں کا پسندیدہ اور نئ زندگی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ اسی نظم کے دوسرے بند میں اس نے شادی اور فتح کے موقع پر گائے جانے والے نغموں کا ذکر کیا ہے۔ شیلے نے زندگی کے رنگوں کو ایک دھن کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

شادی کا کوئی گیت ہو یا نغمۂ فاتح
ملتی ہے ترے نغموں کی لے دونوں کی لے سے
لیکن ترے نغموں کا وہ انداز نہیں ہے
مسحور بنا دیتا ہے جو ساری فضا کو
نغمے جو سنے جاتے ہیں اس روئے زمیں پر
محسوس یہ ہوتا ہے کہ کچھ ان میں کمی ہے
جو حسن کی تکمیل کی ہے راہ میں حائل (3)

ان اشعار میں گیت اور موسیقیت کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کی شاعری اس وجہ سے مشہور بھی ہے۔ کچھ ناقدین ان کو گانے والا پرندہ کہتے ہیں۔ ان کے اشعار سے ان کی مترنم شعریت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے گیتوں کا مزاج، تخیل کی فروانی، جذبات کی شدت، ہلکا پھلکا راگ، منظر نگاری اور موضوعی نوٹ میں اظہار تلاش کے ساتھ ان کی شاعری میں بے ساختگی پیدا کرتی ہے۔ ''اسکائی لارک'' اور اوڈ ٹو دی ویسٹ ونڈ'' اس کی گیت نگاری کے لئے بہترین نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں خالص بہاؤ اور براہ راست اس کے دل سے لکھی گئی ہیں۔ اس نے سمندر کو اپنے غم سے موازنہ کیا۔ اوڈ ٹو دی ویسٹ ونڈ میں اس نے تجارت کو مغربی ہوا اور سیاسی آزادی سے منسوب کیا۔ ظاہری طور پر اس نے جدید نظم نگاری کو آزادی کی اُمید کے طور پر پیش کیا۔ شیلے نے یہاں یہ تاثر دیا ہے کہ جو نغمے خوشی اور جیت پر گائے جاتے ہے ان کا اسلوب مختلف ہے۔ وہ ایسے گیتوں اور نغموں کی بات کر رہا ہے جو روئے زمین پر اپنی دھن سے مسحور کر دے۔ شاعر نے یہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ ایسے نغموں کی کمی کی وجہ سے جشن میں وہ حُسن اور مدہوش پن نہیں جو ہونا چاہیے۔ ان کی مشہور نظم ''اسکائی لارک'' کو بہترین گیتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان اشعار میں شاعر کہتا ہے کہ وہ آدھی خوشی کیسے مناتے ہیں؟ وہ زندگی کا ایسا ہنر سیکھنا چاہتا ہے جو اسے بہتری کا راستہ دیکھائے۔ ان کے اظہار کا ذریعہ ہی ان کے اسلوب میں تاثر پیدا کرتا ہے:

اے عرش کے طائر یہ ہنر تجھ کو ہے معلوم
کچھ اپنی مسرت کا چلن مجھ کو سکھا دے

جس طرح ترے نغموں میں ہے لحن کا جادو
میں بھی کچھ اسی طرح کی تخلیق کروں گا (4)

ان اشعار میں اسکائی لارک کو مخاطب کیا گیا اور شاعر اس خوبصورت پرندے سے اس کی خوشی اور سکون کا راز پوچھ رہا ہے۔اس نے پرندے کے نغمے کی تعریف کرتے ہوئے ان گیتوں کی تخلیق کا جادو سیکھنا چاہتا ہے جو اسے بھی امر کر دے۔ پرندوں کے گیت جو سمجھنے سے زیادہ محسوس کیے جاتے ہیں اور حساس انسان ان نغموں اور گیتوں کو اپنے دل میں ہمیشہ کے لئے پناہ دے دیتا ہے۔شاعر دراصل زندگی میں سکون اور مسرت کا طلب گار ہے۔زندگی کے ہنگامے اور کامیابیوں کے راستے میں رکاوٹیں انسان کے بلند حوصلوں کو مات دے دیتی ہیں جبکہ پرندوں کو ایسی کوئی پریشانیاں لاحق نہیں ہوتی۔ وہ مادی زندگی کے پیچھے بھاگنے کی بجائے آزاد فضاؤں میں سانس لیتا ہے۔شاید اسی لیے شاعر سکائی لارک کی بے پروائی اور پُرسکون طبیعت کا مداح ہو گیا ہے۔

پی۔بی شیلے کے یہاں شاعری میں جذبات نگاری، آرزو اور نا قابلِ حصول چیزوں کے لئے تڑپ ملتی ہے۔ "اوڈ ٹو دی ویسٹ ونڈ" میں شیلے ہوا کی طاقت کی بات کرتا ہے۔وہ اپنی زندگی میں ایک مشن کے لئے نئی ترتیب پیدا کرنے خواہش میں ہوا کے ساتھ چلنے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کی اذیتوں اور تلخیوں نے اس کی بہت سی خوبیوں کو اُجاگر نہیں ہونے دیا۔ وہ ہوا سے درخواست کرتا ہے کہ اسے درخت کے پتوں یا بادل کی طرح اُڑا لے۔ اس نے یہ بھی کہنا چاہا ہے کہ ہوا زمین پر نئی زندگی کی علامت اور انسانوں میں سماجی ترقی کی حوصلہ افزائی کا سبب ہے۔نظم کے آخری حصے میں مغربی ہوا سے کہتا ہے کہ وہ اسے ہمت دے تا کہ وہ اپنا پیغام انسانیت تک پہنچا سکے۔اس نظم میں شاعر نے گہرے جذبات کا اظہار کیا ہے

بکھرا ہوا، جیسے نہ بجھنے والا دل
راکھ اور چنگاریاں، میرے الفاظ انسانوں کے لئے
میرے لبوں سے پہنچا دو بے خبر دنیا کو
پیشن گوئی کا بجا! او ہوا
اگر سرما آیا ہے، تو بہار کیسے پیچھے رہ سکتا ہے (5)

شیلے نے اوپر والے بند میں امید کا دامن قارئین کے ہاتھوں میں تھمایا ہے اور دنیا کو بے خبر کہ کر مخاطب کیا۔ وہ زندگی کے ہنگاموں اور بے معنی مصروفیت کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کے گیت روشن خیال اور فکری تخلیق کی مثال ہے۔قدم بہ قدم اس کے کلام میں سنجیدگی آتی گئی۔شاعر اپنے دل کی بے زاری اور ارد گرد کی مادیت سے تنگ آ گیا ہے۔ وہ کچھ عرصے کے لئے دنیاوی آوازوں سے دور جانا چاہتا ہے۔اس نظم میں اس نے "ہوا" کو مخاطب کیا ہے اور اس کو پیغام رسائی کا ذریعہ بناتے ہوئے اُمید تھمائی ہے کہ غم ہے تو خوشی بھی آنے والی ہے، اندھیرا روشنی کی نوید ضرور دیتا ہے گھٹن زدہ ماحول میں تازہ ہوا کا جھونکا ضرور آتا ہے۔ وہ انسان کو یقین دلاتا ہے کہ دکھ اور تکلیف کی رات کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتی ہے۔ شیلے نے خزاں میں بہار کی نوید دے کر ایسی شمع روشن کی جو زندگی میں مایوسی کے بادل کو ختم کر دے۔ اس نے گیت نگاری میں داخلی خیالات کا اظہار اور ادبی معنی بھی شامل ہے۔ شیلے موسیقی اور ساز کو دل سے کھیلنے کے ساتھ جوڑا۔اس نے اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں سے کیا:

اک نغمہ ابھر جاتا ہے موجوں کی تڑپ سے
واقف ہے جو موسیقی کے ہر زیر وزبر سے
یہ ساز میں ڈوبا ہوا ماحول، یہ منظر
میرے دل بیتاب سے کیوں کھیل رہا ہے(6)

"مونٹ بلانک" اصل میں ایسی چوٹی جو فطرت کے ابدی ہونے کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ چوٹی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔شاعر نے اپنی نظم "مونٹ بلانک" میں لکھا کہ کیسے پہاڑ کی پُراسراریت شاعر کو الہام سے بھر دیتی ہے۔لیکن ساتھ ہی اس کی سرد مہری کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ نظم تہذیب اور ثقافت کے زوال کی بھی علامت ہے۔تہذیب اور ثقافت کسی بھی ملک اور قوم کی پہچان ہوتی ہے اور اگر وہی تباہ ہونا شروع ہو جائے تو پھر وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔شاعر نے یہاں نغمے کا استعارہ استعمال کیا ہے، کیسے لہروں کی تڑپ سے موسیقی پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر شاعر کے دل پر کیسا ہوتا ہے۔ان کی نظموں میں ترنم اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔۔قائین ان کے گیتوں کے مزاج میں کھو جاتے ہیں۔ان کی شاعری میں بے ساختگی اور

موسیقیت ہے۔ پروفیسر ایلٹن کا کہنا ہے:

"بنیادی طور پر شیلے کی ذہانت گیت نگاری میں ہے۔اس کی تمام شاعری واقعی گیت اور گیت نگاری کے جذبے، اس کی گیر شعری مصروں پر ہے، تصویری، افسانوی یا ڈرامائی، جیسا کہ سوئمبن کیساتھ ہے، اور جیسا کی یہ ورڈز ورتھ یا بائرن یا کیٹس کے ساتھ بہت کم ہے۔"(7)

کچھ تنقید نگار شیلے کو گیتوں کا شاعر مانتے ہیاس کی بڑی وجہ اس کے گیتوں اور نغموں میں موسیقت کا جذبہ ملتا ہے۔ان کو اسی خوبی کی بنا پر بائرن اور ورڈز ورتھ سے موازنہ کیا جاتا ہے۔گیت کا تعلق انسان کی حس سامعہ سے ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ الفاظ میں جذبات کی مکمل عکاسی ہو۔ شیلے انگریزی ادب میں اپنی شعری صلاحیت کے سبب معروف شعراء میں نام بنانے میں کامیاب رہے ہے۔ان کے نغموں میں زیادہ فطرت کا حوالہ ملتا ہیاوران کے استعمال سے شاعر داخلی وخارجی کرب کو لکھتا ہے۔آئیڈیلائزیشن اور تجرید شیلے کی گیت نگای کی اہم اور نمایاں خصوصیات میں ہیں۔جیسے وہ ہوا کو نا قابلِ تسخیر قوت کے طور پر پیش کرتے ہوئے مایوسی سے دور انقلابی تبدیلیوں کی طرف توجہ دلاتا ہے، اسی طرح پرندے کو مثالی بنا کے پیش کرنے کا مقصد بے خودی کا تصور ہے۔ شیلے کی شاعری میٹھی اور حیرت انگیز طور پر مترنم ہے۔میتھو آرنلڈ نے ان کے گیتوں کی تکلیف اور کرب کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔

" پہلا کرب اس کا ذاتی کرب ہے جو صرف اس کی زندگی سیوابستہ ہے۔اس کرب کی صدا 'بادل'، 'اسکائی لارک'، اور 'بادِمغرب'، جیسی نظموں میں سنی جاسکتی ہے جو تصوراتی حسن اور ندرتِ خیال میں ڈھلی ہوئی ہے۔"(8)

شیلے کے بارے میں کہا گیا کہ اس نے اپنے دکھ اور تکلیفوں کو شاعری کی زبان میں بیان کیا ہے۔اسی لیے میتھو آرنلڈ نے لکھا کہ شیلے نے اپنی ذات کے کرب اور پریشانیوں کا اظہار اپنی نظموں میں کیا ہے۔وہ کبھی تو بادل کو مخاطب کرتے نظر آئے، کبھی پرندوں کو تو کبھی ہوا

سے باتیں کرتے ملے۔غرض یہ کہ شاعر فطرتی حسن کو بیان کرتے ہوئے اپنے داخلی مسائل بھی پیش کرتے نظر آئے۔شاعر نے بڑی مہارت سے داخلی صورت حال کو منفرد خیال کے ساتھ پیش کیا۔سائمنڈز ان کا دوسرے رومانوی شعراء سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہے کہ ان کی شاعری تین حصوں پر مشتمل ہے ایک ان کی ذاتی و غیر ذاتی غزلیں، دوسرا فطرت نگاری اور تیسرے پر اُمید اور آزادی کے بول ہیں۔اس کی شاعری میں منفرد لہجہ، الفاظ اور رویہ ہے۔انھوں نے ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے جس میں انسان کی نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کا مشاہدہ ہو۔ان کے یہاں لفظوں کی اور منظروں کی روانی بھی ہے۔اپنی ذاتی زندگی کے تجربات کا سہارا لیتے ہوئے انھوں نے انسانی مستقبل کی بات کی ہے انھوں نے ایک مختصر نظم میں جامع اور گہری بات کہی:

گلاب کی پتیاں، جب گلاب مرجاتا ہے،
محبوب کے بستر پر ڈھیر لگایا جاتا ہے؛
اسی طرح تمھارے خیالات، جب تم چلے جاؤ گے
محبت خود بخود سو جائے گی۔(9)

ان کی چند غزلوں کا موضوع انسانی تخلیق اور مستقبل میں زندگی کی شکل وصورت کے بارے میں ہے۔ان کے کردار فانی نہیں بلکہ انسان کی مستقبل کی زندگی کے بارے میں ہے ان کے یہاں الفاظ کا چناؤ، قافیہ، ردیف اور تزئین و آرائش ان کی شاعری کو منفرد بناتا ہے۔شیلے نے دھنیں اپنی زندگی کی مایوسی اور اداسی کے جذبات میں ڈوب کر بنائی۔وہ اکثر اظہار کرتا ہے کہ اسے کہیں بھی سکون یا خوشی نہیں۔اس کے باوجود وہ اپنے اوپر اداسی چھانے نہیں دیتے۔اس میں استعمال ہونے والے میٹر اور اندازِ بیان کو پرندے کے گیت اور بادلوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔جذبات کی تبدیلی کے ساتھ شاعری کے موضوعات اور احساسات بھی بدلتے رہے۔ان کے یہاں زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات سے بے خودی کی لذت غائب ہوتی نظر آتی ہے۔" نیپلز" میں انھوں نے انفرادی جذبات کو پیش کیا۔انھوں نے زندگی سے، تنہائی سے اور روح کی تکلیف سے فرار چاہی ہے۔اس نے اپنی تکلیف اور غم اپنی ذاتی احساس کے طور پر پیش کیا۔وہ زندگی کے مسائل سے تنگ آ گیا ہے اور موت کو بلاتا ہے:

"اس طرح سے ڈھل دوں کہ نہ رہ جائے کوئی داغ
ماضی میں اِنہیں زخموں سے کھیل رہا تھا
یہ آج بھی ہیں میرے شب وروز کے ساتھی
اب موت ہی اِن زخموں کا شاید ہے مداوا
موت آئے مِری زیست کو چپکے سے سلا دے(10)

شاعر نے زندگی کے مسائل اور پریشانیوں کا حل موت سے نکالتا ہے۔مرنے کے بعد ہی دنیاوی پریشانیوں اور دکھوں سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔یہ بات ٹھیک بھی ہے کہ جب تک انسان زندہ رہتا ہے دنیا کے کسی نہ کسی جھمیلے میں پڑا رہتا ہے۔سکوں اور راحت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے مگر کہی بھی چین نہیں آتا۔اسی لئے شاعر موت کو پکارتے ہوئے کہتا ہے کہ موت ہی زندگی میں سکون لاسکتی ہے۔ اسی طرح دیکھا جائے تو نظم "مونٹ بلانک" میں شیلے مافوق الفطرت کرداروں کی بات کرتا ہے۔بھوت اور بے ہوش تصویروں کے بارے میں لکھتا ہے اور اسی نظم میں اس نے "چڑیل کا حوالہ بھی دیا۔ان کی شاعری میں تصوف کے امکانات بھی نمایاں ہے۔شیلے کے یہاں ہمیں بہت سے خیالات اور تجربات ایک ساتھ ملتے ہے۔"ہیمن ٹو انٹلیکچول بیوٹی" میں وہ غیب کا سایہ دکھاتا ہے جو ہمارے درمیاں نظر تو نہیں آتا مگر تیرتا ہے۔ شاعر اس کو مادی روح سے جوڑتا ہے۔وہ مزید یہ لکھتا ہے کہ انسانی ذہین پر اس کا اثر اس کو انتہائی طاقتور بنا سکتا ہے۔شیلے نے کوئین میب، پرومتھیئس، الیسٹر اور اڈونس جیسی فلسفیانہ نظمیں لکھی۔ان کی شاعری کلاسیکی کا درجہ رکھتی ہے:

تو عالمِ عشرت میں رہا کرتی ہے دائم
انساں کی طرح تجھ کو تھکن کا نہیں احساس
الجھن نہیں اک ذرہ برابر ترے دل میں
ہر لمحہ ترا عیش ومسرت کا ہے ہمدم
صدمات کی دنیا سے نہیں تیرا تعلق
خوشیوں سے تجھے پیار ہے اور غم سے ہے نفرت

اس واسطے نغموں میں نہیں تیرے تغیر (11)

یہاں شیلے "اسکائی لارک" کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ تو دنیا میں دائمی کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کو کبھی تھکن یا اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ شاعر حسرت سے اس کو پکارتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کا دل کسی الجھن یا پریشانی کا شکار نہیں اور اس کی زندگی عیش و مسرت سے بھری پڑی ہے۔ انسان کو تو تھکاوٹ بھی ہو جاتی ہے اور وہ اُکتا بھی جاتا ہے۔ شاعر نے پوری نظم میں اس کی تعریف کی اور اس کو انسان کے ساتھ موازنہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ اس پیارے پرندے کا صدموں اور غموں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی زندگی میں مسلسل خوشیاں ہے اور یہ ہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ اس کے گیت اور نغموں میں مسرت ہے۔ انسان جب غم زدہ ہوتا ہے تو وہ غمگین نغمے گاتا ہے۔ جب خوش ہو تو خوشی کے گیت گاتا ہے۔ مگر اسکائی لارک کے نغموں میں ابدیت ہے۔ شاعری میں خیالات واحساسات کے اظہار کے لئے الفاظ کا چناؤ اور بہتر اسلوب بیاں کا ہونا لازمی جزو ہے۔ اس میں اشعار کی جسمانی شاخت، اظہار کے لئے انداز اور اس سلسلے میں استعمال ہونے والے آلات بہت اہمیت کے حامل ہے۔ اسلوب نگاری کے لئے شاعر تشبیہات، استعارات، علامتیں اور شاعرانہ الفاظ کا سہارا لے کر اپنی داخلی و خارجی خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ پی-بی شیلے کی شاعری میں ایک ترتیب نظر آتی ہے۔ انھوں نے سونیٹ اور آزاد نظمیں بھی لکھی۔ ان کے یہاں روایت اور انفرادیت کا ملاپ ہے۔ ان کی شاعری میں آہستہ آہستہ سنجیدگی آئی۔

> " شیلے صرف نغموں کا شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مفکر بھی ہے بنیادی طور پر وہ غزلیت کا بادشاہ ہے لیکن اس کے فلسفیانہ کلام زندگی کی گتھیاں سلجھانے میں رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو سُنہرے خواب بھی دکھاتے ہیں۔" (12)

ناقدین شیلے کو مفکر بھی مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی شاعری میں ابدیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اپنی نظموں میں وہ زندگی کے مسائل اور الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ زندگی کی تہوں کو اُدھیڑ کے ترتیب میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ شیلے کے یہاں آپ کو

اُمید بھی ملتی ہے اور روشنی بھی۔وہ جہاں مایوسی اور مسلسل پریشانی کی بات کرتا ہے وہی اس نے شمع جلا کے راستوں کو روشن کرنے کی سعی بھی کی ہے۔اسکائی لارک شیلے کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے اس نظم میں شیلے نے سکائی لارک کو گیت اور خوشی کی روح کہا۔وہ یہ کہتا ہے کہ "ہمارے شیریں گیت وہ ہیں جو ہماری غمگین سوچ بتاتے ہیں" اسی نظم کی ترتیب اور نرمی کی وجہ سے سوئین برن نے شیلے کو بہترین گلوکار کہا۔اس میں اس نے موت کو خوف ناک کہنے کی بجائے ابدی زندگی کہا ہے۔شیلے کا اسلوب بیان منفرد ہے۔انھوں ایک احساس یا کسی ایک کیفیت کے لئے کئی کئی الفاظ استعمال کیا۔انھوں نے تشبیہات واستعارات سے انسانی رویوں اور معاشرتی حقیقتوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ اپنی شاعری سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نظر آتے ہے:

وہ حسین لمحے جو فطرت کے نظاروں میں تھے گم
وہ حسین لمحے جو صہبائے جوانی میں تھے غرق
وہ حسین لمحے جو خوشیوں کے ترانے میں تھےجو
بھول کر بھی میری دنیا میں نہیں اب آئیں گے(13)

اس نظم میں شاعر بیت لمحوں کو یاد کر رہا ہے۔وہ ان باتوں اور احساسات کو یاد کر رہا ہے جو اب لوٹ کر واپس نہیں آئے گے۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہر کسی کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔شیلے کے ان اشعار مین عالم گیریت پائے جاتی ہے۔شاعر جس کیفیت کی بات کر رہا ہے اس سے ہر انسان ہر لمحہ گزر رہا ہے کیونکہ وقت تھمتا نہیں ہے اور ہماری زندگی کے خوبصورت لمحے ہم چاہتے ہوئے بھی قید نہیں کر سکتے۔ہم وقت کے ہاتھوں مجبور ہے۔جوانی میں بچپن کی یادیں اور باتیں ستاتی ہیں اور بڑھاپے میں جوانی کا جوش یاد کرتے ہے۔انسان ایک تسلسل سے اس ریل گاڑی پر سفر کر رہا ہے مسافر منزل پر پہنچنے والے کو روک نہیں سکتے چاہے وہ اسے کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو۔

شیلے فطرت کو بلند خیال تصور کرتا ہے۔اس کے اسلوب بیان اور طرز شاعری میں جاذبیت ہے۔وہ حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔اوپر اشعار میں وہ فطرت کے خوبصورت

نظاروں، جوانی کے حسین لمحوں اور خوشی کے ترانوں کی بات کرتا ہے ساتھ ہی وہ مایوسی سے اس کے واپس نہ آنے کے دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ان کا اندازِ بیان اور طرز ادا منفرد ہے شیلے شاعری کے فن کو سمجھتے اور اس کیا صولوں کا گہرا شعور رکھتے ہے۔ایک اور جگہ اس نے لکھا:

تمہارے نغموں کی روشن آواز
مہتاب کی کرنوں کی چمک جیسے(14)

اس شعر میں شاعر نے تشبیہ کا استعمال کیا ہے وہ کہتا ہے اور آسمان اور زمین میں پرندے کے خوبصورت گیت کی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے۔شعراء اکثر جب تنہائی میں بیٹھ کر کچھ تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کائنات کی چھوٹی چھوٹی مخلوق کا جائزہ لیتے ہوئے نظر آئے ہے۔ چاند، ستارے، آسمان، بادل، برسات اور پھول وغیرہ تو عام استعارے اور شاعرانہ الفاظ ہیں جو دنیا بھر کے ادیب اپنے اپنے احساس کو سمجھانے کے لئے استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ شیلے نے بھی انہی سے مدد لے کر اپنے جذبات اور تخلیقات پیش کیے ہے۔شاعر نے دنیا میں ہونے والی ناانصافی اور جبر کی بات کی ہے:

"شیلے کی نیچرل شاعری میں دوسری خاص بات جو بار بار سامنے آتی ہے وہ اس کی اپنی ندرت ہے وہ فطرت کی شے کو علامت کی شکل میں پیش کرتا ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں وہ اچھی شناخت اور پہچان رکھتا ہے یہ علامت اس کی زندگی کی عکاس ہوتی ہیاوراس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر سکون کا سبب بن جاتی ہے۔شیلے ان حالات میں اپنی عادت کو عین فطرت سمجھ بیٹھتا ہے"(15)

شیلے کے کلام کو پرکھنے سے اس کی شاعری کی خوبیاں اور تخلیقی صلاحیتیں سامنے آتی ہے۔انھوں نے فطرت کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ عام شعراء کی طرح فطرت کو ایک تصویر کی طرح یا صرف نظموں کو خوبصورت بنانے کے لئے استعمال کرتا اس نے اس کو علامت اور پُر اسرار انداز سے پیش کیا۔ شیلے نے اپنے افکار کو قلم سے ایسے لکھا ہے

کہ آج بھی ادب کے طالب علم ان سے استفادہ حاصل کرنے اور راہنمائی کے لئے پڑھتے ہیں۔ شیلے کے یہاں تشبیہات اور استعارات شاعری میں معنی آفرینی اور اختصار و بلاغت پیدا کرتے ہے۔اس کے ساتھ انھوں نے شاعری کے طرز ادا کی بھی خیال رکھا۔ وہ الفاظ کے انتخاب، ترتیب، آہنگ اور صوتی کیفیات سے شاعرانہ حسن اور تصویر کشی کو بڑی ذہانت سے پیش کیا۔ انھوں نے نفسیات اور موضوع واسلوب کے شعور کو بھی مدنظر رکھا۔ زبان و بیان کو انھوں نے ایک فن بنایا جو شعور کی گہرئی اور ادبی آہنگ میں اہم ہوتا ہے۔انھوں نے سادہ الفاظ میں بڑی حقیقتوں کو لکھا۔ وہ اپنی باتوں کو تشبیہ اور استعاروں میں لپیٹ کر ایک خاص سلیقے سے پیش کرتے:

خود کو جب میں دیکھتا ہوں حال کے آئینے میں
عہد ماضی آہی جاتا ہے رلانے کے لیے
سانس کی مدھم شعاعوں کو ہٹانے کے لیے
وہ حسیں لمحے ہنساتے تھے جو ہر لمحہ مجھے
بھول کو بھی میری دنیا میں نہیں اب آئینگے (16)

فرانسیسی انقلاب 1789ء میں شروع ہوا جس نے فرانس اور اس کے گردونواح میں بھی اپنے سیاسی وسماجی اثرات مرتب کیے۔اسی صورت حال نے سیاسی اور سماجی فضاء کے ساتھ انگریزی ادب پر بھی اپنا اثر چھوڑا۔ادیبوں نے اپنے اپنے انداز میں اردگرد کے حالات کے بارے میں لکھا۔فرانس میں ہونے والے انقلاب نے انگلینڈ کے ادیبوں کو زندگی کے نئے موضوعات سے متعارف کروایا۔جس میں انھوں نے اپنے معاشرے کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی احساسات وخیالات کا برملا اظہار کیا۔ شیلے نے بھی حالات پر گہری نظر رکھی اور اپنے اردگرد ہونے والے ظلم، سیاسی جبر اور عیاش حکمرانوں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے اصولوں، تنگ نظری، مادیت، تعصب پرستی، دنیاوی خواہشات، فرسودہ روایات، پرانے بوسیدہ اصول اور بد خلقی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ "اوزمینڈس" میں اس نے وقتی حکمران کی ستم ظریفی کے خلاف لکھا۔جس میں اس نے وقت سے ساتھ زوال کی کہانی کہی۔ وہ غلامی کی زندگی پر تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اصل ترقی انسان کی آزادی ہے۔انسان صحیح سوچنے اور کام

کرنے کے قابل ہی تب ہے جب وہ آزاد ہوتا ہے۔فرانسیسی انقلاب کا مقصد ہی آزاد ہونا تھا۔ شیلے بھی اسی مقصد کی بات کرتا ہے اور حکمرانوں کے ظلم اور جبر انسان کی تذلیل کہتا ہے۔ ہر انسان کو حق ہے کہ وہ آزادی رہے۔ شیلے نے شکوک وشبہات کے ساتھ فطرت کے بارے میں انسان کی حدود کو تسلیم کیا۔انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف فلسفیانہ نظریہ پیش کیا جس میں اس نے سیاسی اور مالی اصلاحات کو معاشرے کی اصلاح کیلئے ضروری لکھا۔ اسی طرح ان کی نظم ''اوزیمینڈ یاس'' مصر کے قدیم فرعون ،اوزیمینڈ یاس کا مجسمہ اس دور کے ظلم اور جبر کی علامت ہے۔ان نظم میں شاعر نے اوزیمینڈ یاس کا مجسمہ خالی صحرا میں پھنسا ہوا دیکھایا جو یہ پیغام دے رہا تھا کہ ظلم عارضی ہے اور یہ کہ ظالم حکمران ابدی نہیں ہوتا کسی نہ کسی دن اس کو زوال ضرور آتا ہے:

''جھریوں والا ہونٹ اور کسی ظالمانہ حکم کا تمسخرانہ تاثر جو یہ بتاتا ہے کہ مجسمہ ساز نے ان جذبات کا اچھی طرح جائزہ لیا جو ابھی تک ان بے جان چیزوں پر نقش ہیں اور موجود ہیں۔ وہ ہاتھ جس نے اسے بنایا اور دل جس نے جذبات مہیا کیئے اور ان پر یہ الفاظ درج ہیں 'میرا نام اوزی مینڈ ئیس ہے' بادشاہوں کا بادشاہ''(17)

یہ نظم اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ یہ ایک تاریخی آثار ہے۔ یہ مجسمہ ایک زمانے میں عظیم بادشاہ کی علامت ہے۔ یہ بادشاہ کا ارادہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایک میراث چھوڑ جائے کیلن کئی سالوں بعد یہ مضبوط میراث یا تو فطرت کی طاقت سے ختم ہو جاتی ہے یا اس کی بد اعمالیوں سے۔ پریشان آدمی کے بکھرے ہوئے چہرے پر دکھائے گئے تاثرات ان جذبات اور احساسات کی علامت ہیں جو بادشاہ کے زندہ ہونے کے بعد تھے۔مجسمہ ساز نے پتھر پر ان احساسات کو امر کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ انسان اور معاشرے کو آزادی اسی وقت حاصل ہوگی جب وہ محبت کے اصولوں کی پیروی کی جائے۔اس کا کہنا ہے کہ حسن اور محبت کے بغیر مکمل آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ شیلے دنیا میں امن کیلئے کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عام انسان کا

آزاد ہوا میں سانس لے سکے۔ یہ جذبہ بہت کم رومانی شعراء میں ملتا ہے۔ بقول کلٹن براک:

"شیلے ایک مجذوب شاعر ہے جو اپنے مزاج کے اعتبار سے دنیا میں ایسے سماج کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جہاں مساوات کو افضلیت حاصل ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم شیلے کی شاعری کو مکمل طور سے نہیں سمجھ پاتے۔ پھر بھی اس کے کلام سے ایک طرح کی ذہنی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی شاعری ایسی ہے جو محسوس کی جاسکتی ہے۔ اور اس سے لطف لیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت سے دور ہے اور تخیل سے لبریز" (18)

شیلے زمانۂ طالب علمی سے باغی جانا جاتا ہے۔ اس نے تب ہی اخلاقی پستی، مذہبی منافقت اور فرسودہ روایات کے خلاف بغاوت کی۔ اس کی شاعری انسانی فلاح و بہبود کی تبلیغ سے بھری پڑی ہے۔ ان کے یہاں مصنوعی روایوں کے خلاف اُکتاہٹ ہے۔ وہ اس نظام کے خواب دیکھتا ہے جو برائیوں کے خاتمے کا سبب بنتا ہے۔ ان کو خواہشوں اور بلند حوصلے کا شاعر مانا جاتا ہے۔ شیلے عوام کے حقوق کی بات کرتا اور ان کو وقت پر کام کی اُجرت ملنے کی بات کرتا ہے۔ وہ برسرِ اقتدار طبقے کو ان کی بے حسی پر تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔

شیلے کی شاعری میں قدرت کے بارے میں گہری بصیرت ہے۔ " کوئین میب" میں انقلابی خیالات کی ترجمانی کی ہے اسی پر اس کے شعری اور فکری خیالات کی بنیاد ہے۔ شیلے معاشرے میں اصلاح کے واسطے فرسودہ نظام کو بدلنا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ پریشان بھی نظر آتا ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھتا ہے:

"مجھے واپس اس دھرتی ماں کی طرف جانے دو جہاں میں اپنے ہاتھوں سے کھیتوں اور جنگلوں سے اپنی خوراک حاصل کر سکوں" (19)

شیلے کے یہاں علامتوں کا استعمال قابل ذکر ہے۔ ان کی نظموں میں استعمال ہونے والی علامتیں عالمگیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شیلے کو اپنے دیس سے بہت محبت رہی ہے اور ان کے

کلام میں اس کے لئے جذبہ بھی دیکھا گیا ہے۔ وہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ واپس اپنے وطن جا کے خود کھیتی باڑی کر کے خوارک حاصل کرے۔ " اوڈٹو ویسٹ ونڈ " میں اس نے مغربی ہوا کا طاقت ور استعارہ استعمال کیا۔ اسے قدرت کی عظیم طاقت کے طور پر دکھایا۔ جو نئے راستے بنانے کے لئے گیر صحت منداور زوال پذیر ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ویسٹ ونڈ معاشرے میں موجود برائیوں کا خاتمہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس نے اس کوموت اور قیامت کی علامت کے طور پر بھی پیش کیا۔ اس نظم میں اس نے مردہ خیالات کوآزاد کرنے کی دعوت دی ہے۔ نظم کے آغاز میں ویسٹ ونڈ کوجنگلی اورخزاں کے وجود کا سانس کہہ کر مخاطب کیا۔ اس نے کہا کہ ہوا میں ایک طاقت ورقوت ہے جو مردہ پیلے، کالے، سخت سرخ پتوں کو اُڑا کر دور دراز کے علاقوں میں لے جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں علامت نگاری کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے اظہار کے لئے پنی مرضی کی علامتیں استعمال کی۔ آر ایچ فوگل نے کہا:

> " شیلے کی شاعرانہ دنیا فطری دنیا کے بارے میں اس کے تصورات کی لفظی نقل نہیں ہے بلکہ ان تصورات کو ایک شعوری ترتیب اور تشکیل دیا۔ شیلے علامت کے مستقل استعمال میں بھی تجریدی ہے۔ "(20)

علامت نگاری کے اس تجریدی کیفیت نے ان کی نظموں کو سمجھنے میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی زیادہ تر علامتوں کی اپنی ایک دلکشی ہے اور اسے بی۔ پی شیلے کی تخیلاتی ذہانت اور گہری بصیرت کے طور پر قبول کرتے ہے۔ جیسے کشتی اور ندی کی علامت۔ طوفانی دریاؤں یا سمندروں میں کمزور کشتی کا موضوع شیلے کی نظموں میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ کشتی رانی شیلے کی پسندیدہ تفریح کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خطرات سے لطف اندوز ہوتا ہے کیونکہ کشتی کا لہروں کو کھینچنا اسے مغلوب کرتا ہے۔ کشتی میں اسے اپنی شخصیت نظر آتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے سفر میں آگے بڑھتے ہوئے راستے کی کھڑی رکاوٹوں کو بہادری سے چیلنج کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کشتی کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے، سمندر کے اس پار یا کسی دریا کے نیچے، زندگی میں روح کے سفر کی علامت کے

طور پر۔اس کے لئے کھر دراپانی روحوں کیجذ باتی بحرانوں کی نشاندہی کرتا ہے۔شیلے نے الیسٹر میں اس کشتی کی علامت کا اچھا استعمال کیا ہے جہاں شاعر ایک چھلکے میں سفر کرتا دکھائی دے رہا ہے جو ایک بڑے طوفان سے بچ جا تا ہے۔"ادونئس "میں اس نے جون کیٹس کی موت کے غم اور دکھ کو بیان کیا۔اس نے یونانی دیوتاؤں کو مخاطب ہوتے ہوئے جون کیٹس کی موت کے الم ناک سانحے کے بارے میں لکھا:

"وہ آخر تک آیا،نظرانداز اور الگ

ریوڑ سے جدا ایک ہرن،شکاری کے ڈار سے مارا گیا(21)

شیلے،کیٹس کے ہم عصر شاعروں میں سے ہے۔اس کی موت انگریزی ادب کے لئے بڑا جھٹکا تھا۔اس دور کے بہت سے شاعروں نے ان کی موت پر مرثیے لکھے۔کیٹس جیسا تخلیقی شاعر،جو جوانی میں کی مرگیا،شیلے کی نظم ''اڈونئس'' بھی مرثیہ ہے جو کیٹس کو کھونے کے دکھ میں اوران کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئےلکھی گئی۔شیلے نے اپنی نظموں میں تجریدی خیال کو علامت کر طور پر استعمال کیا۔''دی ویسٹ ونڈ'' کو اس نے طاقت،انقلاب اور آزادی کی علامت کےطور پر پیش کیا۔اس نے اپنی نظموں میں بار بار لفظ''زہراورزہریلے'' کا استعمال کیا۔جو کہ ابدیت کی علامت ہے،اسی طرح وقت اور ابدی کو نقاب کہا جو کہ زندگی کی علامت ہے۔انھوں نے شاعری کو پرواز سے جوڑتا اور تصور کرتا کہ ایسے اس کے خیالات کائنات کے گوشے گوشے تک اُڑ کے پہنچ سکے گے۔انھوں نے بادمغرب کو بھی ایک علامت کےطور پر پیش کیا:

مردہ پتی کی طرح سیرا اگر ہوتا وجود

تیری طاقت سے مجھے پرواز ہوجاتی نصیب

میں فضا میں گھومتا گر تیز بادل کی طرح

ہم سفر میں تیرا بن جاتا کسی بھی حال میں(22)

شیلے اڈونئس میں اس علامت کو اور بھی زیادہ اہمیت کے ساتھ استعمال کرتا ہے جہاں،اپنی روح کی کشتی میں شامل ہونے کے راستے پر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔وہ سانس جس کی طاقت کو گیت میں پکارتا ہے۔وہ اس پر اترتا ہے اوراس طرح اس کی روح کی

چھال چل رہی ہے۔مزید کہتا ہے کہ وہ ساحل سے دور، کانپتے ہوئے ہجوم سے دور جن کے بادبان کبھی بھی طوفان کے لیے نہیں تھے۔ کچھ علامتوں کے ساتھ شیلے واضح ہوتا ہے کہ وہ علامت نگاری میں کسی حد تک کولرج کی پیروی کرتا ہے جس نے ایک کشتی میں سفر کے ذریعے زندگی میں روح کی پیشرفت کی نمائندگی کرنا پسند کیا، یہ آلہ قدیم میں بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا تھا۔عقاب اور سانپ۔عقاب اور سانپ کی لڑائیاں ادب میں کثرت سے ہوتی ہے۔شیلے نے ایلیاڈ، اینیڈ، میٹامورفوسس، یا فیری کوئین میں ایسی لڑائیاں دیکھائی ہیں۔ان کے یہاں ہر چیز ایک مقصد کے تحت طے پاتی ہے۔ان کو شاعروں کا "نیوٹن" کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہ اگر وہ سو سال بعد ہوتا تو بیسویں صدی کے " کیمیا گروں میں اسے نیوٹن " کا مقام حاصل ہوتا:

"برسات کی بوندیں یہ خنک بارہوائیں
ہیں دونوں مِری ذات سے وابستہ جہاں میں
طاقت سے کیا کرتا ہوں اولوں پہ حکومت
جو رنگ بدل دیتے ہیں سر سبز زمیں کا
کر دیتا ہوں تحلیل میں پھر پانی میں ان کو
آجاتی ہے اس وقت ہنسی میرے لبوں پر(23)

برسات کی بوندوں ہوا سے ٹکرا کر زمین پر گرتیں ہیں اور موسیقی کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ادیبوں کا پسندیدہ موسم ہے۔اس موسم میں زمین خوشی کے رنگ بکھیرتے ہوئے پھول اُگلتی ہے۔سخت گرمی اور حبس سے روئے زمین پہ چرند پرند جھلس جاتے ہے۔ پانی کی کمی جانوروں کے لئے تکلیف کا باعث بنتی ہے۔درختوں کے سایے تک ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرنے سے قاصر ہو جاتے ہے۔ شیلے نے اس سارے منظر کو بیان کرتے ہوئے برسات کی بہار پر قلم اُٹھایا۔اپنی نظم "بادل" میں وہ لکھتے ہے کہ جب پہاڑ جب برف سے ڈھک جاتے ہے تو بادل اس صاف کرنے اور نئی زندگی دینے میں مدد کرتا ہے۔ شیلے زندگی میں غمگین اور نا اُمید رہا، شاید اسی لیے اس نے شاعری میں قنوطیت کو داخل کیا۔جبکہ فطرت کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ ہمیشہ پُر اُمید اور خوش نظر آیا۔ وہ نظم " بادِ مغرب " میں موسم سرما کی ٹھنڈی ہوا پھولوں کی

رعنائیوں کی بات کرتے ہوئے نئی زندگی کی بات کرتا ہے۔ ان کے ہاں خواہشات اور ناکامیوں کی بات ایک ساتھ کی جاتی ہے۔ ساری عمر وہ کامیابی کے لئے محنت کرتا اور اس کا راستہ دیکھتا ہے۔ اسی کی جستجو میں وہ تاریک راہوں کا سفر بھی کرتا نظر آتا ہے۔ افسردہ خیال اور روحانی کرب ان کی شاعری میں واضح نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں اس سلسلے میں سوالات بھی ملتے ہیں جو وہ خود سے کرتا ہے۔ وہ خود سے خوشی اور راحت کے راستوں کا پتہ پوچھتا ہے۔ وہ شدید تکلیف کی حالت میں وقت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ آخری سانس تک اس کا ساتھ دے اور اس کو تنہا نہ چھوڑے:

> " شیلے کی غیر مطمئن اور ناآسودہ زندگی ہمیشہ اُسے کرب کے بستر پر تڑپاتی رہی وہ مسلسل ناکامیوں سے پریشان ہو چکا تھا اور زندگی کے ہر موڑ پر افسردگی کا شکار تھا۔ رنج، ملال، آنسو، فراق، درد، تڑپ اس کی قسمت میں داخل ہو چکے تھے۔ اس لیے ان سے فرار حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ (24)"

شیلے نے ایک ناکام زندگی گزاری اور یہ کرب اس نے مسلسل محسوس کیا۔ زندگی میں وہ ناکامیوں سے اس قدر مجبور ہو گیا تھا کہ اس نے افسردگی اور نااُمیدی اپنے پر طاری کر لی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ زندگی کے رنج اور دکھ موت تک اس کے ساتھ چلے گے۔ انہی دکھ اور تکلیفوں کی وجہ سے وہ شاعری میں مسلسل فرار ہوتا نظر آیا۔ حالانکہ شیلے کا رومانوی شعراء میں شمار ہوتا ہے جس میں غنائیت اور مٹھاس کا عنصر زیادہ ہے۔ فطرت کی خوبصورتی اور حسن کا وہ زندگی بھر عاشق رہا۔ نقاد کہتے ہیں کہ ورڈز ورتھ آخری عمر میں نیچر سے کچھ دور ہو گیا تھا لیکن شیلے ساری عمر فطرت اور فطرت کی رعنائیوں میں ڈوبا رہا اور اسی سے اس نے انقلابی سوچ میں فرار ہو کر اس نے خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے۔ کزامیاں اس کے اس پہلو پر بات کرتے ہوئے کہتا ہے:

> " شیلے کا تعلق انسانوں کے اس مخصوص گروہ سے تھا جنھوں نے جذبات اور ادراک کے مرکب سے انقلابی ذہن کو تیار کیا۔

بچپن سے جوانی تک یہ چنگاری اس کے اندر سلگتی رہی۔"
(25)

شیلے کو ساری زندگی مشکلات کا سامنا رہا جن کا شیلے نے بڑے صبر اور جرأت سے مقابلہ کیا۔ شیلے نے مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے حوصلہ محبت سے حاصل کیا۔ اس کی محبت صرف انسانوں تک محدود نہ تھی۔ اس کے حصار میں ہر جاندار مخلوق آتی تھی۔ جن میں جانور، پرندے، درخت، پھول، بادل، ہوا سب ہی شامل تھے۔ شیلے میں کائنات سے ہم کلام ہونے کا ہنر موجود تھا۔ وہ کبھی کسی سے بھی مخاطب ہو جاتا تھا۔ پھر چاہے وہ دی ٹرمپفٹ آف لائف ہو یا ہو یا کیٹس پر لکھی گئی ڈراما ہو یا نظم اس کی بے مثال عنائیت، تمثال اور جذبہ ہر سطر میں موجود ہوتا ہے۔ شیلے نے اپنی نظموں میں نا قابلِ یقین فطرت اور تخیلاتی احساس کے بارے میں با قاعدگی سے لکھا۔ انھوں نے اپنی آخری نظم می محبت، وجود اور آزادی کی جستجو کو ظاہر کیا۔ اس میں وہ خوبصورتی کو سراہتا ہے اور غیر حقیقی محبت کا جشن مناتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرتا ہے شاعری اخلاق کا آغاز ہے۔ جو انسان کو فکری خوبصورتی کی طرف متوجہ کرتا ہے یہ ہی شاعرانہ تخلیق کا مظہر ہے:

برسات کے آنچل میں جھلکتے ہیں کئی رنگ
سورج کی کرن پڑتی ہے جب قوس قزح پر
رنگوں میں نکھر جاتی ہے یہ سات طرح سے(26)

شاعر نے برسات کا تذکرہ چھیڑ کر اس کو رنگوں کی بات کی ہے۔ برسات میں مسلسل بارشیں ہر طرف سبز اور ماحول کو خوش گوار کر دیتی ہیں۔ مسلسل بارش میں قوس قزح نمودار ہو کر اپنا جلوا دکھاتی ہے اور آسمان پر ایک رونق بخشتی ہے۔ شیلے اس موسم میں زمیں کے ساتوں رنگوں کا ذکر کرتا ہے کہ اس سے بجھی اور بے رونق زندگی میں بہار آجاتی ہے۔ ادب میں بادل کئی معنوں اور علامتوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ سردی کے بادل کو تباہی اور درد کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح برسات کو زندگی کو خوشی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اسی موسم میں قوس قزح سات رنگوں کے سات آسمان کی زینت بنتی ہے۔ اس کو خوشی اور جشن کا علامت سمجھا جاتا ہے۔ ان اشعار سے شیلے کے جذبات کی بازگشت کا احساس ہوتا ہے۔ جو ان کی نظم "بادل" میں کہے

گئے مترنم الفاظ کائنات کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ان کے یہاں جیسے اور بہت سے موضوعات پر لکھا گیا وہی فطرت نگاری پر بھی خاص توجہ دی گئی۔ یہاں جذبات کی روانی میں ان کے کہے گئے مصرعے نغمات کی صورت میں گنگناتے ہیں۔قارئین ان کی شاعری پڑھنے کے بعد نغمات کی طرح مچلتے ہیں اور ہنگامے بھری دنیا میں سکون لیتے ہیں۔ ان کے یہاں صرف قدرتی جذبات کوشعور کے ساتھ پیش کیا۔ان کے اشعار قارئین کو ان کی شخصیت اور شاعرانہ صلاحیتوں کو جانچنے کے لیے اُبھارتے ہیں۔ کچھ ناقدین کہتے ہیں کہ شیلے نے خوبصورت تخیل، تخلیقی مصلحتوں اور روایتی تقاضوں سے اپنی شاعری کو خوشگوار بنایا:

"ہے پیشِ نظر گہرے سمندر کا نظارہ
پہنچے نہیں اِنساں کے قدم جس کی زمیں پر
پھیلی ہے ہری بیگنی گھاس اس کے کنارے
بل کھاتی ہے رہ رہ کے جو موجوں کے سہارے(27)

ان اشعار میں بھی شاعر اپنے تخلیقی ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے برسات میں سمندر کے نظارے کی بات کرتا ہے۔سمندر میں انسان چل تو نہیں سکتا،اسی کے کنارے سبزے سے بھر چکے ہیں۔لہریں ساحل سے ٹکراتے ہوئے خوبصورت منظر پیش کرتی ہے۔دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائے برسات کا موسم اپنا رنگ بکھیرتا نظر آئے گا۔شعراء کا یہ پسندیدہ موسم ہے۔ان کے یہاں شاعری میں فکری و معنوی اعتبار سے تخلیقی ہنر کے کئی رنگ نظر آتے ہے۔ تہذیبی روایت کے فکری استعارے ماضی،حال اور مستقبل کے رنگ میں نظر آتے ہے۔

شیلے نے جمالیاتی آہنگ میں تخلیق کو زندہ رکھنے کا احساس فراہم کیا۔ان کی شاعری ان کی ذات کی آئینہ دار ہے۔ شیلے کمال شاعر تھا کہ ان کی شاعری میں پُراسراریت،بھید،کنایہ اور استعارے ساتھ ساتھ ملتے ہیں۔یہ ہی نہیں ان کے یہاں سادگی اور معصومیت بھی برابر ملتی ہے۔ان کے یہاں تخلیقی کرب کو مناسب ترین الفاظ سے پیش بھی کیا۔اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات سے اپنی فن کو چار چاند لگائے۔جس طرح ہر انسان کا مزاج،نفسیات اور سوچنے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے اسی طرح شعر کا فہم بھی ہر انسان اپنے مزاج اور نفسیات کے مطابق کرتا ہے:

"شیلے اپنے مزاج کے اعتبار سے فطرت کی باہوں میں سوتا اور جاگتا رہتا ہے۔ اس لیے فطرت سے اس کا سلوک یکساں نہیں رہتا۔ وہ اپنی مختصر نظموں میں مناظر قدرت کو بڑے خوبصورت انداز اور حسین لفظوں میں بیان کرتا ہے کبھی کبھی وہ فطرت کو ایک ایسا روحانی پیکر سمجھ کر پیش کرتا ہے۔جس کی تقسیم ناممکن ہے اور کبھی وہ اُسے مختلف اجزا کی شکل دے کر ہر ایک جز میں زندگی کا وجود پاتا ہے۔فطرت سے متعلق کچھ نظموں کو وہ ایسے رنگ سے رنگ دیتا ہے جیسے کوئی افسانہ نگار کسی خوبصورت کہانی کو نئے خیال سے آراستہ کرتا ہے۔"(28)

شیلے کے یہاں مافوق الفطرت کرداروں کا عکس ملتا ہے۔جس کی مثال "حیمن ٹو انٹلیکچوئل بیوٹی" ہے۔اس نظم میں شاعر ایک روح سے مخاطب ہوتا ہے۔شاعر اپنے جذبات کا موازنہ ان بھوتوں سے کرتا ہے جن کو وہ لڑکپن سے ڈھونڈتا آ رہا ہے۔جیسے ہم بچپن میں جن، بھوت اور پریوں کی کہانیاں سنتے ہیں اور پھر ان جن، بھوتوں کو حقیقت کی دنیا میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔شاعر بھی اسی احساس سے لکھتا ہے۔وہ روح سے عقیدت سے پیش آتا ہے اور دعا کی طرح اس کی مدد کی درخواست کرتا ہے۔ایک تاثر یہ بھی ملتا ہے کہ شیلے روحوں پر یقین نہیں رکھتا مگر جب دعا کی بات آتی ہے تو وہ ان بھوتوں کو الہامی فطرت سے جوڑتا ہے۔ویسٹ ونڈ میں شاعر نے کہا کہ ہوا اپنی قوت سے جو پتے اور بیج بکھیرتی ہے ان کو بھاگتے ہوئے بھوت کہہ کر مخاطب کیا۔اسی نظم میں ان بکھرے ہوئے بیجوں سے پیدا ہونے والے پھول اور نئے پودے جنم لیتے ہیں۔ان کو بھی شاعر نے ایک الہامی فطرت سے جوڑا۔بچپن میں وہ اکثر جنگلوں، ویرانوں کی کہانیاں سنا کر خوش ہوتا اور اس طرح وہ ذہنی سکوں حاصل کرتا۔اس میں وہ روحانی قوت کا ذکر کرتا ہے جو دیکھی نہیں جاسکتی بلکہ انسان سے نامعلوم اور پوشیدہ ہے:

کچھ طاقت وران دیکھا خوف ناک سایہ
ہمارے درمیاں تیرتا ہے یہ ان دیکھا

وہ مختلف دنیا کا دورہ کرتا ہےغیر متواتر پروں سے

جیسے موسم گرما کی ہوا ایک پھول سے دوسرے پھول تک جاتی ہے(29)

وہ انٹلیکچوئل بیوٹی کو نا معلوم اور خوف ناک چیز کہتا ہے۔اسے یقین ہے کہ یہ انسانی دل میں مضبوط حالت کے ساتھ ہے۔ وہ ان دیکھی مخلوق سے خوف زدہ معلوم ہوتا ہے۔اس نے کہا کہ یہ مخلوق مختلف دنیا کا مسلسل سفر کرتی ہے۔اور ہوا سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ان دیکھی مخلوق ایسے سفر کرتی ہے جیسے ہوا پھولوں کے درمیان سفر کرتی ہے۔ شیلے مافوق الفطرت کرداروں کو بہت اہمیت دیتے نظر آئے ہے، جیسے وہ ان کی طاقت یا قوت سے متاثر ہو اور خوف زدہ بھی۔نظم کے آخر میں وہ ایک دعا گو کی طرح روح کی خوبصورتی کی طاقت کو اپنا سکون کہتا ہے۔ شیلے نے دنیا کے اخلاقی اور روحانی اقدار سے خالی اور بدنما ہو جانے کا احتجاج کیا ہے۔ وہ اس بات کو بھی مانتا ہے کہ دنیا مادی ارتقاء کے سفر میں ہیاور ایک دن سب بدل جائے گا۔اس کے باوجود اخلاقی اور روحانی اعتبار سے وہ اپنی آواز بلند کرتا ہے۔اور اسی طرح وہ یہ سمجھتا ہے کہ ثقافتی ،تہذیبی اور انسانی قدروں کی عمارت کو مادیت کے فروغ نے مسمار کر دیا ہے۔شیلے انسان کی معیار زندگی کو بلند کرنے اور بہتر زندگی گزارنے پر فوقیت دیتا نظر آیا:

یہ چاند یہ تارے جو فزوزاں ہیں فلک پر\
لگتے ہیں چمکتی ہوئی مکھی کی جماعت\
میں خود کو نئ شکلوں میں کر لیتا ہوں تبدیل\
جھونکے سے چلا کرتی ہیں جب تیز ہوائیں(30)

شاعر نے فلک پر چمکنے والے چاند ستاروں کو مکھی کے جھتے سے تشبیہ دی ہے۔شاعر بادل کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ جب تیز ہوائیں چلتی ہیں تو نئ نئ شکلوں میں خود کو بدل کر لیتا ہے۔بادل جو تیز دھوپ کی وجہ سے آبی بخارات بن کر آسمان کی طرف سفر کرتے ہیاور آسمان پر تیز ہوا سے تیرتے ہے،سب قدرتی مناظر کی حسین شکل ہے۔ شیلے نے اس نظم میں بادل کو ایک کردار کی طرح پیش کیا ہے۔ان کے ہاں مافوق الفطرت ایک بار بار آنے والا موضوع ہے۔شاعری کے ذریعے بھوتوں اور روحوں کی تلاش کرتے نظر آتے ہے۔

وہ کسی اور دنیا کا تخیل پیش کرتے ہیں جس میں وہ ان دیکھی چیزوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہے، کبھی وہ ان کو بہت طاقت ور تصور کرتے ہے۔ شیلے اس مخلوق سے متاثر بھی ہے کہ شیلے اس معاملے میں یونانی ادب کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہے۔ اپنی نظم "بادل" میں بھی انھوں نے ایسا نظریہ پیش کیا:

جب اُوڑھ لیا کرتا ہوں اک موٹا لبادہ
مشکل سے گزر پاتی ہیں سورج کی شعاعیں
ہوجاتی ہے محرب کی مانند مری شکل
مضبوط ستون بنتے ہیں میرے لیے کہسار(31)

یہاں بادل نے موٹا لباس اُوڑھ لیا جس میں سورج کی شعاعیں بمشکل گزرتی ہوں۔ بادل تیز ہوا میں سفر کرتا اور تپتے سورج میں محرب کا نقشہ اختیار کرلیتا ہے۔ بادل جب جوش سے گزر رہا ہوتا ہے تو ایک فاتح کی طرح گرجتے ہوئے چلتا ہے۔ اور جیسے ہی طوفان تھمتا ہے تو قوس قزح ابھر کر اس کے حُسن میں چار چاند لاگا دیتی ہے۔ شیلے کو ایک فلسفی کی حیثیت سے دیکھے تو انھوں نے اپنی شاعری میں کوئی نہ کوئی فلسفہ ضرور پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں جو فلسفہ ملتا ہے وہ انسانی تربیت وتہذیب روایت کا بہت دخل ہے۔ وہ ساری زندگی تخیل اور حقیقت کے درمیان جھولتے رہے۔ انھوں نیا پنی زندگی سے ہم آہنگی لانے کی کوشش کی مگر ناکامیوں اور تلخ حقیقتوں نے ان کی زیادہ چلنے نہ دی۔ مگر تخلیقی وشعری دنیا میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئے۔ انھوں نے پوشیدہ وظاہری لفظوں سے ایک الگ جہان بنانے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ انھوں نے ظلم کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور معاشرے کی برائیوں اور ظالم حکمرانوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا:

" شیلے صرف نغموں کا شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مفکر بھی ہے۔
بنیادی طور پر وہ غزلیت کا بادشاہ ہے لیکن اس کے فلسفیانہ کلامِ
زندگی کی گتھیاں سلجھانے میں رہنمائی بھی کرتے ہیں اور ٹوٹے
ہوئے دلوں کو سنہرے خواب بھی دکھاتے ہیں۔ جب وہ اپنے

غم کو نغموں کا لباس پہنا تا ہے تو اس کا شعری کمال آسمان کو
چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔"(32)

شیلے کے یہاں روایت کا فنی و فکری زور جھلکتا ہے۔ان کے کلام میں نئے راستے ملتے ہیں۔انھوں نے زندگی کے بدلتے ہوئے رنگ، دریا، سمندر، چاند ستارے اور پرندوں کے ذریعے اپنے احساسات کو سمو کر پیش کیا۔ان کی شاعری میں شگفتگی اور نفاست، رعنائی اور لطافت واضح نظر آتی ہے۔ان کے یہاں جادو اثری اور فسوں کاری سے انگریزی ادب میں اہم کردار ادا کیا:

جو معطر کرتے ہیں کو ہ ذرمیں کے جسم کو
جذبہ وحشت کا تیرے زور ہے چاروں طرف
تیری فطرت میں نہاں تخریب اور تعمیر ہے
آ بھی جا اے باد مغرب سن آواز سن (33)

شیلے چونکہ رومانی اسکول آف تھاٹ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ان کے یہاں فلسفے کو پیش کرنے کا انداز مختلف ہے۔ وہ کائنات میں برائیوں کے مسائل پر بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شاعر کسی بھی معاشرے کا حساس طبقہ ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کی پریشانیوں کو گہرائی سے دیکھتے ہوئے ان کے حل کے لیے کوشاں ہوں۔

" شیلے کی بصیرت انگیز شاعری اس لیے بھی مختلف انداز میں قارئین کو پریشان کرتی ہے۔آرتھوڈوکسنے اسے جارحانہ طور پر آزاد پایا جبکہ کافر اسے حد سے زیادہ مذہبی سمجھتے ہے۔جیسے اگنو سٹسک مونٹ بلاک کو پسند کرتے ہیں لیکن انٹلیکچوئل بیوٹی کی مزاحمت کرتے ہیں۔حقیقت میں یہ نظم دونوں یقین رکھنے والے اور نہ رکھنے والوں کے اقدار کی تعریف کرتی ہیاور ہم سب طاقت ور مذہبی تخیل سے سیکھتے ہیں۔"(34)

شیلے کے یہاں صوفیانہ رنگ ہے وہ اکثر جبر اور ظلم کے خلاف بولتا ہے۔ وہ یہ گمان

کرتا ہے کہ سمندر میں وسیع سبز جزیرے ہیں جو معاوضہ انسان کی تکلیفوں اور اذیتوں کا جو اس دنیا میں برداشت کی جاتی ہیں۔اس نے شاعری کی خوبصورتی کو آزادی سے جوڑا۔وہ انسان کی غلط خواہشات پہ غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔"تاسف"اس کی مختصر اور جامع نظم ہے۔اس میں وہ دکھ اور شدید کرب کی حالت کا اظہار کرتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اس دنیا میں کہیں سکون نہیں ہے۔ساری خوشیاں یہاں سے چلی گئی ہیں اور اداسی اور غم نے ڈھیرا ڈال لیا ہے:

اے عروس حسن فطرت عیش وعشرت کا سنگار
اے نشاط زندگی اے گلشن دل کی بہار
اے نگار وقت اے دوشیزہ لیل ونہار
اب مزاج زندگی ہے کشتہ رنج والم
موت کی آہٹ پہ لغزیدہ سے ہیں میرے قدم(35)

اس بند میں شاعر نے حسن فطرت،نشاط زندگی،گلشن دل کی بہار اور دوشیزہ لیل و نہار کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے قدموں کو موت کی آہٹ کا غم بیان کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ زندگی میں ہر چیز ایک وقت ماضی کا حصہ بن جاتی ہے۔ہر خوشی،ہر غم،زندگی کی بہاریں اور خزائیں سب گزر جاتی ہیں۔اسی نظم میں آگے جا کے وہ کہتا ہیکہ چند پلوں میں دن رات کی خوشیاں ماضی کا حصہ بن جاتی ہے۔گرما ہو یا موسم سرما،دھند ہو یا برف سب موسم جانے کے لئے آتے ہیں۔ماضی کی یادیں ہمیشہ غم زدہ کر دیتی ہیں:

رات اور دن کی خوشی اک خواب ماضی بن گئی
موسم گرما ہو یا ہو آمد فصل بہار
یا ہو کہرے کا دھندلکا یا ہو برفیلی پھوار
دیکھ کر ان موسموں کو ڈوب سا جاتا ہے دل
اور غم کی بیکران ظلمات میں کھو جاتا ہوں(36)

اسی طرح وہ"اسکائی لارک"میں ماضی اور غم کی بات کرتا ہے۔یہاں وہ انسان کا سکائی لارک سے موازنہ کرتا ہے کہ کیسے انسان ماضی کی یادوں اور پچھتاؤں سے جوڑا رہتا

ہے۔انسان اس کرب اور تکلیف میں زندگی گزار دیتا ہیاور کسی حد تک اسی وجہ سے وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا مانا نہیں پاتا۔وہ کہتا ہے کہ اسکائی لارک اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہے،اس کے پاس نہ تو ماضی کے پچھتاوے ہیں اور نہ ہی ایسی یادیں جن کو دہرا کر وہ اپنے حال کو خراب کر لے:

انسان اگر راہِ صداقت کا ہو رہرو
نفرت سے تکبر سے یا ہو خوف سے بیزار
وہ غم کے جھمیلوں میں رہے لاکھ پریشان
آنکھوں سے نہ ٹپکائے لرزتے ہوئے آنسو
تیری طرح پھر بھی اُسے راحت نہ ملے گی (37)

وہ کہتا ہے کہ اسکائی لارک کو اپنی خوش نصیبی پر ناز ہیاس کا تعلق غم اور دکھ کی دنیا سے نہیں۔اس کے نغمے خوشی اور مسرت سے بھرپور ہے۔وہ تھکن اور الجھن سے پاک ہمیشہ خوشیوں کے دیس میں سانس لیتا ہے۔شیلے بھی اسکائی لارک جیسی زندگی کی خواہش کرتا ہے جس میں غم اور الجھن جیسی کوئی بات نہ ہو۔وہ ایک آئیڈئل زندگی کا طالب ہے۔اس کے لیے وہ طرح طرح کے کام کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔شیلے کے یہاں زندگی میں دو طرح کی ناکامیاں ہیں۔ایک جو اس کی ذاتی زندگی سے وابسطہ ہے اور دوسرا دنیا نے غم اور دکھ۔شاعر کے اس دکھ اور تکلیف کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

وہ داخلی دنیا ہی میں پاتے ہیں مسرت
شہرت ہو کہ طاقت ہو سکوں ہو کہ محبت
کوئی بھی نہیں ان کے مقدر میں ہے لیکن
پھر بھی وہ رہا کرتے ہیں عشرت کے جہاں میں (38)

ان اشعار میں اس نے اپنے آپ کو بے جان موج،آسماں سے برسے ہوئے پانی اور بجھے ہوئے چراغ سے تعبیر کیا۔اسی لئے کچھ ناقدین ان کو اداسی کا شاعر کہتے ہیں۔اوڈ ٹو ویسٹ ونڈ میں وہ بے بسی کے سائے میں بیٹھا ہے اور قوت پرواز سے مدد طلب کرتا ہے اس

کے ساتھ ہی وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے بھی کوشاں نظر آتا ہے۔ان کے یہاں ہمیں مجبور انسانوں کے خوابوں کے نقش ملتے ہیں:

"اس کے علاوہ اس کے انداز بیان میں جاذبیت ہے کیوں کہ
وہ کسی چیز کی تعریف بغیر کسی پرکھ اور پہچان کے نہیں کرتا۔اس
کی دوربین نگاہیں حقیقت کو تلاش کر لیتی ہیں۔"(39)

وہ کامیابیوں کے لئے محنت کرنے باوجود ناکامی کا شکار رہا۔ان کی بہت سی باتوں کو حقیقت پسند ایک فضول شوق کہتے ہے مگر ان کے لئے زندگی سراب اور شاعری حقیقت ہے۔وہ یہ خیال کرتے ہے کہ شاعر ہونے کے معنی زندگی میں فکری وفنی رویہ اختیار کرنا۔شاعر پوشیدہ لفظوں میں بری سے بڑی بات کہہ دیتا ہے۔ان کے یہاں جذبہ واحساس کی وضاحت کلاسیکی مزاج کا خاصہ ہے۔انکے یہاں الفاظ پہلے اور معنی میں سمجھ آتے ہیں مگر غور کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی اور بات سمجھا رہے ہیں۔انھوں نے زندگی کے روزمرہ کے معاملات کو شاعری کا حصہ بنایا اور ان کے یہاں سنجیدگی ایک نرالے انداز میں ملتی ہے:

میں آگ اُگلتے ہوئے کہساروں کو اکثر
بارش کے تقاطر سے کیا کرتا ہوں خاموش
لہراتی ہیں جب تیز ہوائیں مرا پرچم
اس وقت ستاروں کے چمکتیہوئے جھرمٹ
اس طرح نظر آتے ہیں جیسے کی گگن میں
اس گوشے سے اس گوشے تک وہ تیر رہے ہیں(40)

ان اشعار میں شاعر مستقبل قریب میں زندگی کے اقدار کو بلند کرنے کی پیشن گوئی کرتا ہے۔وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتا اور اُمید رکھتا ہے کہ ان قریب دنیا ہمدردی،محبت اور فلاح کے نغمے گائے گی۔ان کے شعروں میں بیک وقت بہت سے رنگ نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں ہمیں کبھی ربط،تسلسل اور وحدت کی خوبیاں ملتی ہیں اور کبھی یہی ربط چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو کر ایک نظم کی شکل میں ملتا ہے۔اسی طرح وہ فطرت کو انسان

کی خوبیاں اور خامیوں سے جوڑتے۔کبھی وہ پتوں کو تشبیہ کے طرز پر پیش کرتے تو کبھی پودوں کو۔گویا ان کے یہاں فطرت کا انسان سے گہرا تعلق ہے جو ہمیں ان کی ہر دوسری نظم میں ملتا ہے:

میرا اگر ہوتا وجود مردہ پتی کی طرح
تیری طاقت سے مجھے پرواز ہو جاتی نصیب
میں فضا میں گھومتا گر تیز بادل کی طرح
کسی حال میں بھی میں تیرا ہم سفر بن جاتا
بحر کی موجیں جو نچلی سطح پر ہیں مطمئن
وہ بھی تیری زد میں آ کر مضطرب ہو جاتی ہیں (41)

اب اس شعر میں شاعر ہوا کو کہتا ہے کہ اگر وہ انسان نہ ہوتا اور درخت کا ایک ٹوٹا ہوا مردہ پتہ ہوتا تو وہ ہوا کے زور سے اُڑتا پھرتا۔شاعر ہوا کو اتنا طاقت ور بنا کر پیش کر رہا ہے کہ جس کی مدد سے وہ فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتا ہے۔اگلے ہی مصرعے میں وہ یہ خیال پیش کرتا ہے کہ اس کا دل چاہتا ہے وہ کسی بھی طرح ہوا کا ہم سفر بن جائے۔ان اشعار میں شاعر کا ایک ہی مقصد ہے اور ایک ہی خواہش کر رہا ہے کہ کاش وہ ہوا کا ساتھی ہو اور اس دنیا سے دور ہو جائے۔کاش وہ زندگی کی الجھنوں سے دور بھاگ سکے۔اس کی نظم "اڈونیئس" کیٹس کی یاد میں لکھی گئی ہے۔اس نظم میں سوران تمام نقادوں کی نمائندگی کرتا ہے جنھوں نے کیٹس کے کام پر تنقید کی۔دراصل شیلے یہ بات کہنا چاہتا ہے کہ ناقدین کی بے وجہ تنقید نے کیٹس کے کیریئر کا ختم کر ڈالا:

سورج آگے آتا ہے، اور بہت سے رینگنے والے انڈوں سے
سورج ڈوبتا ہے، اور سارے عارضی کیڑے
موت کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں سورج کے بعد،
اور ابدی ستارے دوبارہ روشن ہوتے ہیں
دنیا میں یہ ہی نظام سب زندوں کے ساتھ ہوتا ہے

ایک بڑے دماغ آگے جاتا ہے، اس خوشی میں
زمین دیکھتا ہے اور جنت کو چھپتا ہے، اور جب
یہ ڈوبتا ہے، حشرات جو مدم یا اس کی روشنی لیتے ہیں
چھوڑ دیتے ہیں روشنی کو روح کی خوف ناک رات میں (42)

اس شعر میں شاعر کیٹس کے موت کا افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایسے بڑے شاعر جب تک زندہ ہوتے ہیں تب تک کسی چھوٹے شاعر کا سِکہ نہیں چلتا۔ ایسے شاعر اپنے فن سے ہیرے جیسے الفاظ تراشتے ہیں اور ان کو مصروں میں جڑ کر شاعری کی شکل میں پیش کرتے ہیں شیلے کیٹس کو بڑا شاعر مانتے ہوئے کہتا ہے کہ ان پر تنقید کرنے والے ان کے اصل فن اور خوبیوں سے واقف نہیں ہیں۔ شیلے نے یہ بھی کہا کہ جب ایسے شاعر سامنے آتے ہیں تو پھر چھوٹے شاعروں کے لیے ادب میں جگہ نہیں رہتی۔ ایسی صورت میں بڑے شاعروں کی موت چھوٹے شاعروں کے لیے خوشی کا باعث بنتی ہے:

روشنی سے، سمندر کا شعلہ بیدار ہوتا ہے
جس سے پرندوں نے اپنی چہچاہٹ لی
تمام پھول جو کھیت یا جنگل میں کِھل جاتے ہیں
ان کی کانپتی ہوئی پتیاں دن کو بوسہ دیتی ہیں
جھولتے ہوئے ان کی خوشبو پھیل جاتی ہے
آہستہ اور ناقابل طور پر نئی کرن جلتی ہے
اور بھیجتی ہے اپنی آہیں مسکراتی ہوئی ہوا تک (43)

اب اس شعر میں شیلے زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں بات کرتا ہے۔ وہ قدرت پہ بات کرتے ہوئے سمندر پر پڑنے والی سورج کی کرنوں کو شعلہ کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے اس روشنی سے پرندے اپنے نغمے اور گیت لیتے ہیں۔ اس روشنی کی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ کھیتوں اور جنگلوں میں کھلنے والے پھول اپنی آنکھیں کھول کر اس خوبصورت دن کو بوسے کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ مزید وہ کہتا ہے کہ جب پھول کھل کر ہوا میں جھولتا ہے تو اس کی

خوشبو بکھرتی ہے جو مسکراتی ہوئی ہوا کی قوت سے پیغام بھیجتی ہے۔ شاعر نے یہاں اپنی پسند کے استعارے اور علامتیں استعمال کر کے حقیقتوں سے پردہ ہٹانے کو کوشش کی ہے۔ یہ نظم شیلے کی آخری نامکمل نظم ہے اور اس کا اصل مفہوم یا اصل پہیلی ان کو موت کے ساتھ نامکمل ہی رہ گئی:

یہ دنیا ہم سب کیلیے نرس ہے، ہم جانتے ہیں
یہ دنیا سب کی ماں ہے جو ہم محسوس کرتے ہیں
اور موت کا آنا ایک خوف ناک دھچکا ہے
فولادی اعصاب پر محیط دماغ تک
جب ہم سب کچھ جانتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں یا دیکھتے ہیں
ایک غیر حقیقی اسرار کی طرح گزر جائے گا (44)

"موت پر" اس نظم میں شیلے موت کی تلخ حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ موت کا مطلب ہرگز ختم ہو جانا نہیں۔ موت کسی چیز یا انسان کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مطلب ایک اور دنیا ہے۔ موت کو بہت سے ادیبوں اور شعراء نے اپنے اپنے لحاظ سے لکھا۔ کہیں یہ علامت کے طور پر شامل ادب ہے تو کہیں یہ خوف پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوئی۔ کہیں موت سانحہ کے طور پر ملتی ہے تو کہیں یہ پُر اسراریت کے طور پر۔ اسی طرح شیلے نے بھی اس کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا۔ اس نے موت کو خوف یا پُر اسراریت کہنے کی بجائے ایک اُمید یا ایک نئی دنیا کہا۔ اس کے خیال میں موت صرف ظاہری طور پر نظر نہ آنا ہے۔ موت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کا نام ہے۔ موت کو ڈرنے کی بجائے خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔

روایتی حق رائے دہی، انقلاب اور سیاسی اصلاحات کے بارے میں ان کے خیالات ظاہر ہوئے، خاص طور پر ابتدائی سالوں میں، معاشرے کی تخلیق نو کے لیے وہ پریشان اور فکر مند نظر آئے۔ شیلے نے عقلیت پسندی اور روشن خیالی کو اس حقیقت کی وجہ سے مسترد کر دیا کہ اس کا پختہ یقین تھا کہ فطرت، محبت اور تخلیق کی طاقت میدان کو نئے سرے سے تشکیل دے سکتی ہے اور تقدیر کے اندر انسانیت کو روحانی طور پر دوبارہ پیدا کر سکتی ہے۔ وہ اپنی زندگی

کے تجربات سے اپنے جذبات کو پیش کرتے۔ایک جگہ انھوں نے کہا کہ زندگی کے کانٹوں پر اس کا خون بہہ رہا ہے:

تیرے بھائی موت نے چلا کے یہ مجھ سے کہا
کیا میں اس کا ہم سفر بننے کا خواہش مند ہوں؟
نیند تیری گود کے معصوم بچے کا روپ ہے
جس کی آنکھیں تیرے جادو سے اثر انداز ہیں
دوپہر کے وقت جب اس کے قریب آتا ہوں میں
مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح شور کرتا ہے
موت کی خواہش نہ مجھ کو نیند کا ارمان ہے
رات دھڑکن ہے مری اور شاعری جان ہے(45)

شیلے "خطاب شب" میں نیند کے بارے میں بات کی۔نیند دراصل آدھ موت ہوتی ہے۔انسان سونے کے بعد دنیا جہان سے بے خبر اور بے پرواہوتا ہے۔اوپر شعر میں شاعر نے کہا کہ نیند معصوم بچے کی طرح ہوتی ہے۔یہاں شاعر نے اسے استعارے کی شکل میں پیش کیا۔اس نے کہا دوپہرے میں جب وہ نیند کے سمندر کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہے تو اسے یہ مکھیوں کی طرح شور کرتی محسوس ہوتی ہے۔مگر اگلے ہی مصرعے میں اس نے کہا کہ اسے تو نیند یا موت کی طلب نہیں ہے۔رات اس کے لئے خوبصورت تحفہ ہے کیونکہ وہ ایک شاعر ہے۔شاعروں کے لیے رات کے بہت سے معنی ہے جن میں سب سے پہلے سکون، راحت اور خاموشی ہے۔اس سے آگے وہ لکھتا ہے:

ان کے دامن میں کوئی اس طرح کی دولت نہیں
تو ہی میرے شعر کو دے سکتی ہے حسن و جمال
آ میری شہزادی شب آ بھی جا میرے قریں
تجھ کو سینے سے لگا لوں پیار کرنے لے لیے(46)

اس نظم میں دراصل شیلے نیند کو معنوی طور پر پیش کرتا ہے۔وہ شب کو محبوب کی طرح

پکارتا ہے۔اس سے مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ وہ موت کا انتظار محبوب سے بچھڑنے کے بعد کرے گا۔ نیند بھی اُسے تب ہی آئے گی۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کوئی نعمت تو نہیں اور نہ ہی کوئی دولت ہے۔ وہ اسے پکارتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی شاعری، اس کے لفظوں اور اس کے خیالات کو اصل حسن و جمال تو صرف محبوب کے توسط سے ممکن ہے۔ وہ کسی دیوانے عاشق کی طرح شب کا انتظار کرتا ہے۔

شیلے کی شاعری کا فکری و فنی جائزہ لینے سے ان کی شخصیت میں سیاسی، سماجی، اور تاریخی شعور اور آ گاہی ملتی ہے۔ان کے کلام میں شعور واضح اور نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے فن کی دنیا کے امتیازات اور طبقات سے بالا تر ہو کر اپنی زندگی کی حقیقتوں اور تجربات کی روشنی میں کام کیا۔ ان کے اہم موضوعات میں بے چینی اور حوصلہ افزائی، اختیارات کے خلاف بغاوت اور آزادی کی تلاش، محبت کی جستجو اور تخیلاتی بصیرت ہیں۔ ان کی شاعری کا طرز فکر سماجی عدم مساوات اور اخلاق باختگی کے خلاف آواز بلند کرتا ہوا ملتا ہے۔

شیلے کے خیال میں محبت اور خوبصورتی انسان کے خیالی اور ذہنی عناصر ہیں۔ اپنی مجلس میں، وہ محبت کو تحفظ اور تخلیق کا جزو قرار دیتے۔ معاشرے میں جس چیز کو وہ برا اور ناانصافی پر دیکھتے اُس کو بر مِلا کہہ دیتا۔ اُن کے کلام میں حق وصداقت مثالیں کی واضح ملتی ہے۔ ان کے یہاں جابر اور ظالم نظام کو بدلنے کا ارادہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں انسان کے بدلتے ہوئے رویے کے لیے گہری سوچ و بچار ہے اسی سوچ اور فکری انداز سے ایک خاص طرح کی فضا تخلیق پاتی ہے۔ ان کے یہاں انسان خواہشات میں ایسیسفر کا حصہ بن گیا ہے جو آگے کو چلتا جا رہا ہے اور واپسی کا کوئی امکان نہیں۔۔ ان کی شاعری کے الفاظ، مصرعے اور اشعار پڑھنے اور سننے والوں کو دیر تک یاد رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہمہ جہت حقیقتوں سے کام لیتے ہوئے تقریباً زندگی کے پہلوؤں پر قلم اُٹھانے کی سعی کی ہے۔ وہ اپنی شاعری کے انتخاب میں سنجیدہ رہے۔ ان کے کلام میں فکری و فنی نقطہ نظر سے کئی رموز پوشیدہ ہیں انھوں نے قلم کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور اپنے اردگرد کی سیاسی و معاشی صورت حال پر بے دھڑک لکھا۔

انھوں نے اپنے اردگرد کے گھٹن زدہ ماحول کو محسوس کیا اور اس کے خلاف جب لکھا تو ایک احتجاج کی آواز بلند ہوئی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ معاشرے میں گھٹن اور دباؤ بھگاڑ اور خرابی کا سبب بنتا ہے۔ ان کے خیال میں رومانوی طرز احساس فکری ارتقاء کی پہلی سیڑھی ہے۔انیسویں صدی میں شیلے کو ناقدین نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ جبکہ وکٹورین دور میں ان کو مثالی محبت کا شاعر مانتے ہوئے رومانوی شاعر کہا جانے لگا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پھر ایک دفعہ ان کی شاعری بے توجہی کا شکار ہوئی جبکہ تیس کی دہائی میں دوبارہ ان کی فکری وفنی منظر کشی، گہری فلسفیانہ سوچ اور جذباتی پختگی نے تنقید کے میدان میں اپنی جگہ بنائی۔ بورا نے ان کو شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے اعلیٰ درجے کے فلسفی شعراء میں شمار کیا۔ کچھ ناقدین ان کو منطق دان کہتے ہیں۔

شیلیشاعری میں اصول پرستی، مثالیت اور تصوریت کا حامی تھا۔ اس کیلئے شاعری اخلاقی قدروں، اوج کمال اور نقطہ عروج تھی، حوصلہ مندی اور بلند نظری کا قائل تھا اگر اس کی شخصیت دیکھی تو وہ خوش باش، زندہ دل اور مستقبل مزاج رکھتا ہے مگر کئی نقادوں کے قبول خبطی، تنگ دل، کاہل اور آرام طلب جانا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کا شوق صرف شاعری پڑھنا لکھنا تھا۔ اس نے انگریزی ادب کی بہترین کو بہترین شاعری دی۔ آج بھی دنیا بھر کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہیں۔ جن کے بغیر انگریزی ادب مکمل نہیں ہوتا۔ یہ فلسفیانہ ادراک، ذہانت، شعور کے اظہار، فطری مشاہدے، کلاسیکی رومانویت، سادہ لوگوں کی زندگی معنی خیز شاعری زندگی کی حقیقتوں کی ہمہ گیر شاعرانہ کارنمایاں پر مبنی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔www.ijiras.com

۲۔Kitab New Poems, Selected Bysshe, Percy Shelley,
p.257 1980, Lahore, Mahal,

۳۔ایضاً ص258 ۴۔ایضاً

۵۔شبنم گورکھپوری، باد مغرب، اتر پردیش (انڈیا)، 1990ء ، ص:146

۶۔p.1 above, As Poems, Selected Bysshe, Percy Shelley,

۷ایضاً ص2

۸۔شبنم گورکھپوری، باد مغرب، محولہ بالا، ص:142

۹۔ایضاً، ص:117 ۱۰۔ایضاً، ص:97

۱۱۔ایضاً، ص:49 ۱۲۔ایضاً، ص:81

۱۳:p، above As Poems, Selected Bysshe, Percy Shelley,
259

۱۴۔ایضاً، ص262

۱۵۔شبنم گورکھپوری، باد مغرب، محولہ بالا، ص:115

۱۶۔ozymandia/ 46565/ poems/ www.poetryfoundation.org//:https

۱۷۔above, As Poems, Selected Bysshe, Percy Shelley,
p.359

۱۸۔mab.htm-queen/ 1813/ shelley/ archive/ www.marxists.org//:https

۱۹۔،above As Poems, Selected Bysshe, Percy Shelley,
p.326

۲۰۔ایضاً،

۲۱۔ایضاً
۲۲۔شبنم گورکھپوری، بادمغرب، محولہ بالا،ص:59
۲۳۔ایضاً،ص:72
۲۴۔ایضاً
۲۵۔ایضاً،ص:131
۲۶۔ایضاً،ص:23
۲۷۔ Percy Shelley, Bysshe, Selected Poems, As above, p.359
۲۸۔ایضاً،ص259
۲۹۔شبنم گورکھپوری، بادمغرب، محولہ بالا،ص:102
۳۰۔ایضاً،ص:98
۳۱۔ایضاً،ص:110
۳۲۔ایضاً،ص:54
۳۳۔ایضاً،ص:136
۳۴۔ایضاً،ص138
۳۵۔شبنم گورکھپوری، بادمغرب، محولہ بالا،ص:80
۳۶۔ایضاً،ص:81
۳۷۔ایضاً،ص:73
۳۸۔ایضاً،ص:101
۳۹۔ایضاً،115
۴۰۔ایضاً،ص:53
۴۱۔ایضاً،ص:130
۴۲۔ایضاً،ص138
۴۳۔ایضاً،ص130
۴۴۔ایضاً،ص138
۴۵۔شبنم گورکھپوری، بادمغرب، محولہ بالا،ص:106
۴۶۔ایضاً،ص:107

☆☆☆☆☆☆☆

منیر نیازی اور پی بی شیلے کی شاعری

(تقابلی مطالعہ)

منیر نیازی اور پی بی شیلے دونوں مختلف زبانوں کے شاعر ہیں اور دونوں کے عہد بھی مختلف ہے۔ دونوں منفرد اور چونکا دینے والے اسلوب کے ساتھ معروف شاعر رہے ہیں۔ ادیبوں کے تخلیقی سفر کو سمجھنے کے لئے قارئین اور ناقدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کے اردگرد کے ماحول کو اپنے دھیان میں رکھے۔ ان کی تہذیب اور سماج کے حالات وواقعات جن میں لکھنے والے کی ابتدائی زندگی گزری ہو۔ بچپن، جوانی اور وہ روایات اور ثقافت جن کے ساتھ زندگی گزاری ہو، ان افراد اور ماحول کے واضح اثرات ان کے ادبی کام اور شخصیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ منیر نیازی کو دیکھا جائے تو وہ اپنے اندازِ فکر کے تخلیق کار ہے۔ ان کی طرز بیاں اور شعری سخن کی پیروی مشکل ہے۔ انھوں نے پنجابی اور اردو شاعری کے حوالے سے دور حاضر میں اپنی الگ پہچان بنائی اور بین الاقوامی سطح پر پاکستانی ادب کے اعتبار و وقار میں اضافہ کیا ہے۔ اپنی شاعری کی بدولت قارئین کے دلوں میں اہم مقام بنانے میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ ان کے یہاں سنجیدہ موضوعات کے ساتھ فطرت کی آگاہی اور اصنافِ ادب میں نمایاں کام ملتا ہے۔ ان کی تخلیق میں معصومیت ہے۔ ان کے یہاں سیاسی، معاشرتی اور فلسفیانہ فکر وفن کی انفرادیت رواں دواں ہے۔ کچھ ناقدین ان کو باغی بھی کہتے رہے۔ وہ کلام اس انداز سے کہتے کہ قائین بار بار داد دیتے۔ انھوں نے رومانی شاعری کرنے کے علاوہ عمدہ اور منفرد تصور حیات کے ساتھ روایات کے فرسودہ خیالات کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کے یہاں تخیل پردازی کا بہترین مظاہرہ ملتا ہے۔ انھوں نے شعر وشاعری کے علاوہ گیت اور کالم نگاری بھی کی۔

انھوں نے شاعری میں مختلف موضوعات کا تجربہ کیا جو عام اور ذہین قاری کو سمجھنے میں آسان لگے اور وہ اس سے بھرپور فائدہ بھی اُٹھا سکیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں اپنے

جذبات واحساسات کا اظہار ہے۔ان کی نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے موضوعات پر پختگی حاصل رہی ہے۔انھوں نے جنگل، چڑیل، تنہائی، سانپ اور چیل جیسے استعارے، علامتی اسلوب اور شاعرانہ الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے اپنے دور کے انسان کی داخلی وخارجی کرب کا اظہار کیا ہے۔منیر نیازی کے کلام کی وسعت کو سمجھنے اور ان کے تجرباتی اور تخیلاتی موضوعات پر گرفت حاصل کرنے کے لیے ان کی داخلی وخارجی حقیقتوں کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ان کی شاعری پڑھنے اور سننے والوں کو دیر تک یاد رہتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں تلخ حقیقتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے تقریباً زندگی کے پہلوؤں پر قلم اُٹھانے کی سعی کی ہے۔وہ اپنی تخلیق کے انتخاب میں سنجیدہ رہے۔

دوسری طرف پی بی شیلے کو دیکھے تو وہ اٹھارھویں صدی میں انگریزی ادب میں مقبول ہوئے اور اپنی شاعرانہ تخلیق کے باعث انگریزی ادب میں اپنا نام بنانے میں کامیاب ہوئے ادب کی دنیا میں ان کا شمار شعوری اور لاشعوری طور پر نمایاں شعراء میں ہوتا ہے انگریزی ادب میں انھوں نے نغمہ نگاری میں خوب نام کمایا۔ان کی تخلیق میں معاصر سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقائق واضع طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ شیلے اپنی زندگی میں تو مشہور نہیں ہو سکے مگر ان کی موت کے بعد ان کے کام کو بہت شہرت ملی۔ شیلے بچپن سے ہی ذہین اور تخلیقی صلاحیت کا مالک تھا۔ انھوں نے شاعری میں منفرد انداز سے اپنے ہم عصروں میں نام کمایا۔ کچھ ناقدین کے خیال میں وہ باغی ہے اور روایت سے منحرف ہونے کا الزام لگاتے ہے۔

انھوں نے شاعری کی زبان کا سہارا لیتے ہوئے اپنے اردگرد کی سچائیوں اور روایتی جذبوں کا اظہار خیال پیش کرنے کے لیے ایک ایسی فضا قائم کرتے ہے کہ ان کے سامنے فرسودہ روایات ڈگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری ایک چہچہاتے ہوئے پرندے کی مانند ہے ان کا انقلابی آئیڈیلزم فرانس کے انقلاب کا نتیجہ ہے۔اس نے محبت کو لامحدود اور خوبصورتی کو عقل کا نام دیا۔ شیلے کہتا ہے کہ خوبصورتی اور محبت انسان کے ذہنی اور تخیلاتی عناصر ہے۔اپنی محفلوں میں وہ محبت کو تحفظ اور تخلیق کا حصہ کہتا ہے۔ شیلے کی شخصیت میں سیاسی، سماجی، مذہبی اور تاریخی شعور اور آگاہی موجود تھی۔ان کے کلام میں شعور واضح اور نمایاں دکھائی دیتا

ہے۔شاعری میں انھوں نے معاشرے کے مظلوم اور پسے ہوئے طبقے کے حق میں آواز اُٹھائی منیر نیازی اور پی بی شیلے کی شاعری کا تقابلی جائزے کے لئے ہم ان کے شعری کلام کا موازنہ کرے گے۔ان کی تخلیق وتخیل کو حقائق اور فطرت کے درمیان روشنی کے ماحول میں سامنے لا کر امتزاج ظاہر کرنے کی کوشش کرے گے۔

دونوں شعراء میں کچھ خصوصیات ایک جیسی ہیں اور کچھ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔دونوں کے شعری کلام کے تقابل کرنے سے ان کے کلام کی مماثلت اور تفاوت کا انداز لگایا جا سکتا ہے۔کیونکہ دونوں معاشرے میں جس چیز کو برا اور ناانصافی پر دیکھتے اُس کو برملا احتجاج کرتے۔دونوں کے کلام میں حق وصداقت مثالیں کی واضح ملتی ہیں۔دونوں جابر اور ظالم نظام کو بدل کر انصاف پسند معاشرے کے لئے کوشاں رہے۔دونوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے مافوق الفطرت کرداروں کو جگہ دی،دونوں سیاسی ومعاشی حالات کی بات کرتے اور فطرت نگاری کو بھی اپنے احساسات کی روانی کے لیے پیش کرتے نظر آئے۔انھوں نے اپنی شاعری میں ہمہ جہت حقیقتوں سے کام لیا اور تقریبا زندگی کے تمام پہلوؤں پر قلم اُٹھانے کی سعی کی۔دونوں شعراء اپنی شاعری کے انتخاب میں سنجیدہ رہے۔ان کے کلام میں فکری وفنی نقطہ نظر سے کئی رموز پوشیدہ ہیں۔دونوں نے قلم کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور اپنے ارد گرد کی سیاسی ومعاشی صورت حال پر بے دھڑک لکھا۔نیز ہم مثالوں سے دیکھتے ہیں کہ ان دو مختلف عہدوں کے مختلف زبانوں اور تہذیب کے لوگوں میں کیا کیا مماثلت ہے اور دونوں میں کتنی تفاوت ہے۔

ظلم کے خلاف آواز:

منیر نیازی جب اپنے اردگرد کے گھٹن زدہ ماحول کو محسوس کرتے تو اس کے خلاف ایک احتجاجی آواز بلند کرتے نظر آتے۔کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ معاشرے میں گھٹن اور دباؤ بھگاڑ اور خرابی کا سبب بنتا ہے۔انھوں نے اپنے قلم کو حق آواز کے لئے اُٹھایا۔وہ سچے اور کھرے شاعر ہے جو حقیقت کو اپنے انداز اور منفرد لب ولہجے سے پیش کرتے ہے۔وہ زندگی کے مشکل دنوں کی مسافت کو موضوع بناتے ہوئے نفرت اور بے وفا وراثت کا تذکرہ کرتے ہے۔وہ

لوگ کی محبت اور خوشیوں کے لئے تکلیف اور دکھ کو موضوع بناتے ہے۔حکمران طبقے کے سخت خلاف تھے:

اک مسافت پاؤں شل کرتی ہوئی سی خواب میں
اک سفر گہرا مسلسل زردء مہتاب میں
حاصلِ جہدِ مسلسل، مستقل آزردگی
کام کرتا ہوں ہوا میں جستجو نایاب میں (1)

ان اشعار میں منیر نیازی نے اپنی کیفیات کو بیان کرنے کی کوشش کی۔انھوں نے بڑے سادہ الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے گہری بات کی ہے۔وہ مسلسل حاصل کرنے جدوجہد اور تھکا دینے والی مسافت کی بات کرتے ہے۔ان کے یہاں ہر اس بات پہ احتجاج ملتا ہے جو ناانصافی اور ظلم و جبر پر ہو۔منیر نیازی کئی جگہوں پر حیرانی و پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہے کہ وہ ایک آزاد ملک کیلئے ہجرت کر کے آئے ہے مگر یہ جس آزادی کے لئے جدوجہد کی گئی وہ ہجرت کے بعد کہی بھی نظر نہیں آئی۔وہ یہ بھی کہتے ہے کہ معاشرے میں تعمیر اور اصلاح کرنے والوں لوگوں میں کمی ہوتی جا رہی ہے اور اس کی بڑی وجہ رہنماؤں میں لالچ اور دنیاوی اسباب کے لئے دلچسپی ہے۔وہ یہ بھی سمجھتے ہے کہ ان کا ملک کا مسلسل زوال کا سبب حکمران طبقے کی عوام کی فلاح کی بجائے عیش وعشرت کی زندگی ہے۔

پی بی شیلے کے یہاں بھی انسانوں کے دکھ اور تکلیفوں کے لئے احتجاج کا شور ملتا ہے۔وہ بھی منر نیازی کی طرح اپنے معاشرے میں برائیوں اور ناانصافیوں کے لئے تکلیف محسوس کرتا اور عوام کے حق کے لئیا حتجاج کرتا نظر آیا۔شیلے بھی آزادی اور عوامی حقوق کی بات کرتا ہے اور حکمرانوں کے عوام سے ناروا سلوک کو غلط سمجھتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ آزادی سب کا حق ہے۔شیلے نے شکوک وشبہات کے ساتھ فطرت کے بارے میں انسان کی حدود کو تسلیم کیا۔انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف فلسفیانہ نظریہ پیش کیا جس میں اس نے معاشرے کی اصلاح کے لئے سیاسی اور معاشی نظریات کے اصولوں کی بات کی۔وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ظلم کا دور ہمیشہ نہیں رہتا اور ظالم حکمران ہمیشہ نہیں رہتا

کسی نہ کسی دن اس کو زوال ضرور آتا ہے:

جھریوں والا ہونٹ اور کسی ظالمانہ حکم کا تمسخرانہ تاثر
جو یہ بتاتا ہے کہ مجسمہ ساز نے ان جذبات کا اچھی طرح جائزہ لیا
جو ابھی تک ان بے جان چیزوں پر نقش ہیں اور موجود ہیں۔
وہ ہاتھ جس نے اسے بنایا اور دل جس نے جذبات مہیا کیئے
اور ان پر یہ الفاظ درج ہیں
"میرا نام اوزی مینڈئیس ہے" بادشاہوں کا بادشاہ (2)

یہ نظم ایک تاریخی آثار ہے۔ یہ مجسمہ ایک زمانے کی عظیم بادشاہت علامت ہے۔ یہاں باشاہ کے جاہ وجلال کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ یہ حکمران چاہتا تھا وہ اپنی ایک وراثت چھوڑ جائے مگر بہت سالوں بعد یہ مضبوط وراثت یا تو قدرت کی طاقت سے ختم ہو جاتی ہے یا اس کی بداعمالیوں سے۔ آدمی کے بکھرے ہوئے چہرے پر دکھائے گئے تاثرات ان جذبات اور احساسات کی علامت ہیں جو بادشاہ کے زندہ ہونے کے بعد تھے۔ مجسمہ ساز نے پتھر پر ان احساسات کو امر کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ شیلے اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ انسان اور معاشرے کو آزادی اسی وقت ممکن ہے جب وہ حق اور برابری کے اصولوں کی پیروی کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سچائی اور انصاف کے بغیر مکمل آزادی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ شیلے اپنی شاعری سے دنیا میں امن کیلئے کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عام انسان کا آزاد ہوا میں سانس لے سکے۔ یہ جذبہ بہت کم رومانی شعراء میں ملتا ہے۔

گیت نگاری:

دونوں شعراء کے یہاں گیت نگاری ملتی ہے۔ گیت وہ نظم ہے جو سُر اور ترنم سے گائی جا سکے۔ دنیا کی ہر زبان میں گیت لکھے اور گائے جاتے ہیں۔ منیر نیازی کے یہاں گیت نگاری میں تخیل کی الگ دنیا ملتی ہے۔ انھوں نے چند سال باقاعدہ فلموں کے لئے گیت لکھے۔ اگر چہ ان کی نظموں اور غزلوں میں گیت کی خوبیاں بھی برابر ملتی ہے۔ ان کے گیتوں میں بہت سے حقیقیت سے ماورہ کردار بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ ان کرداروں کو حقیقی رنگ دے کر زندگی کے

مختلف رنگوں کی بات کرتے ہے۔اس کے علاوہ ان کے یہاں نسائی کیفیت اور جذبات کا اظہار بھی ملتا ہے۔اس کے لئے ان کا انداز اور لہجہ مختلف ہے۔وہ کسی بھی جذبے کے اظہار کے لئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لیتے۔انھوں نے نسائی جذبات کے اظہار کے لئے زیادہ گیت کا سہارہ لیا۔گیت نگاری کے حوالے سے ان کی تخلیقی شخصیت کا ایک مختلف پہلو نظر آتا ہے:

"منیر نیازی نے گیت بھی لکھے۔انھوں نے گیت کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس کے مخصوص آہنگ اور لہجہ میں لکھے اور نسائی کیفیات کا اظہار فنکارانہ انداز سے کیا۔"(3)

منیر نیازی نے گیتوں کو تخلیقی اور تخیلی مزاج کے ساتھ لکھا۔انھوں نے گیتوں کو صرف رومانی لہجے اور مقصد کیلئے نہیں لکھا۔انھوں نے اس کو فکری وفنی خوبیاں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے یہاں گیتوں میں بے وفا محبوب اور دل کا درد بیان ملتا ہے۔وہ کہتے ہے کہ محبوب کی یاد ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔اگر وہ محبوب کو بھلانا چاہے دے تو ایسا ممکن نہیں لگتا۔ایسی صورت میں دل بغاوت پہ اُتر آتا ہے۔ان کے گیتوں میں جذبات کی شدت اور احساسات کی وسعت ہے۔ان کے گیتوں کو نفیس اقبال ان کے آبائی علاقے ہوشیار پور سے جوڑتے ہے کہ ان کے گیتوں میں برندابن اور رادھا کرشن علامتیں ہیں اور جن سندر ناریوں کا انھوں نے تذکرہ کیا ہے وہ حقیقت میں ان کی بستی کی دوشیزائیں ہیں:

کچھ رحم کر نہ اتنے تغافل سے کام لے
آ اور مسکرا کر مرا ہاتھ تھام لے
تیرے بغیر مجھ کو تو جینا ہوا محال
اے صاحبِ جمال (4)

منیر نیازی نے اس گیت میں محبوب سے التجا کرتا نظر آتا ہے۔وہ محبوب سے رحم کی درخواست کر رہا ہے اور ہاتھ تھام کر ساتھ زندگی گزارنے کی بات کہتا ہے شاعر دل کے ہاتھوں مجبور دل کا درد سناتا ہے۔محبوب کی بے رخی اور بے پروائی کی شکایت کرتا ہے۔ان کے گیت میں جہاں رومانی احساسات ملتے ہے وہی ایک مخلص انسان کا درد بھی سنایا گیا ہے۔منیر

نیازی کی طرح پی بی شیلے کے یہاں بھی ایسے مترنم شاعری کی جھلک ملتی ہے۔ پی بی شیلے کی شاعری میں گیت اور موسیقیت کی خوبیاں پائی جاتی ہے۔ان کی شاعری اس وجہ سے مشہور بھی ہے۔ کچھ ناقدین ان کو گانے والا پرندہ کہتے ہیں۔ان کے اشعار سے ان کی مترنم شعریت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے گیتوں کا مزاج ،تخیل کی فروانی، جذبات کی شدت، ہلکا پھلکا راگ، منظر نگاری اور موضوعی نوٹ میں اظہار تلاش ان کی شاعری میں بے ساختگی پیدا کرتی ہے ان کے شعروں میں نغموں کا رنگ بھرپور ہے اور یہ خوبی ان ایک شاعر کی حیثیت سے نمایاں کرتی ہے۔ ان کے گیتوں میں زندگی کے لمحات کو قید کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔انھوں نے سادہ لفظ آہنگ میں انسانی رشتوں کی تمام گہرائیوں کے ساتھ جذبوں کو پیش کیا۔ قائین ان کے گیتوں کے مزاج میں کھو جاتے ہیں۔ان کی شاعری میں بے ساختگی ہے۔ پروفیسر ایلٹن کا کہنا ہے:

" بنیادی طور پر شیلے کی ذہانت گیت نگاری میں ہے۔اس کی تمام شاعری واقعی گیت اور گیت نگاری کے جذبے ،اس کی گیر شعری مصروں پر ہے، تصویری، افسانوی یا ڈرامائی، جیسا کہ سوئمبن کے ساتھ ہے، اور جیسا کی یہ ورڈز ورتھ یا بائرن یا کیٹس کے ساتھ بہت کم ہے۔"(5ترجمہ)

شیلے کے یہاں ان کی زیادہ تر شاعری میں موسیقیت ہے۔گیتوں میں آہنگ کے لئے اصناف ادب کا علم اور بہتر استعمال ہونا ضروری ہے۔منیر نیازی کی طرح انھوں نے بھی شاعری کو وقتی جذبات نگاری کے لئے نہیں لکھا بلکہ ادب کو ایسے افکار پیش کیے جو وقت کے ساتھ ساتھ قارئین میں مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔انھوں نے منیر نیازی کی طرح تخلیقی قوتوں کو فطرت کی آگاہی، جذباتی ونفسیاتی بحران ، رشتوں پر بے اعتباری اور روح عصر کی عکاسی کیلئے استعمال کیا۔ان کی انہی خوبیوں کی وجہ سے آج بھی ادب والے ان سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتے۔ دونوں شاعروں نے اپنے نظریات کو اپنے اپنے لوگوں کے فکری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ پی بی شیلے کی نظم:

شادی کا کوئی گیت ہو یا نغمہء فاتح

ملتی ہے ترے نغموں کی لے دونوں کی لے سے
لیکن ترے نغموں کا وہ انداز نہیں ہے
مسحور بنا دیتا ہے جو ساری فضا کو(6)

اکثر شادیوں اور فتوحات پر گیت گا کر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔پوری دنیا میں یہ روایت ہے کہ جب بھی کسی کی شادی ہوتی ہے یا کوئی کہیں کسی میدان میں جیت جاتا ہے تو خوشی کے جشن منائے جاتے ہیں، گیت گائے جاتے ہیں۔ پی بی شیلے نے بھی انھی احساسات کا اظہار کیا ہے۔اس کے گیتوں میں شفافیت اور نزاکت ہے جو سننے والوں کے دلوں کو چھو کر موم کر دیتے ہیں۔پی بی شیلے بھی منیر نیازی کی طرح جذبوں کا شاعر ہے۔

فطرت نگاری:

منیر نیازی نے فطرت نگاری کو تخیلاتی اور فنکارانہ انداز میں معنی عطا کیے۔ایک شاعر جب معاشرے کی بدصورتی کی بات کرتا ہے تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ خوبصورت مناظر اور فطرتی حسن سے ناواقف ہو۔منیر نیازی کے یہاں جب مایوسی کے اندھیرے کا ذکر ملتا ہے تو امید کی روشن صبح کا ذکر بھی ملتا ہے۔ان یہاں جب سنسان جنگلوں کی دہشت ملتی ہے تو وہی ہمیں سکون کا مکان بھی ملتا ہے، جہاں شاعر شہروں کے شور اور بے سکونی کی کہانی سنائی جاتی ہے وہیں شہروں کی رونق بھی ملتی ہے۔ وہ کہیں تپتی ہوئی دھوپ کو موضوع بناتے ہے تو کہیں بادل کی بوندوں کا تذکرہ کرتے ہے۔انھوں نے کمال مہارت سے صبحِ بہار اور عہدِ خزاں کو یاد کیا ہے۔ان کی شاعری کی خوبصورتی ہی یہ ہے کہ کبھی کسی نظم میں کچھ کھو جاتا ہے تو کبھی کسی غزل میں کچھ مل جاتا ہے۔ان کی شاعری کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں تنہائی بے باکی سے دروازہ کھولے اندر آتی ہے اور ماضی کی یادوں کو چھیڑنے لگتی ہے۔ان کی شاعری میں جذبات کی شدت، جمالیاتی لہجے کی بناوٹ اور اسلوب کی خوبصورتی ملتی ہے:

"صبحِ بہار میں اسے
جا کے مِلوں گا میں
جس سے بچھڑ گیا تھا میں

عہدِ خزاں کی شام میں (7)

منیر نیازی کی طرح پی بی شیلے کا اسلوب بیان منفرد ہے۔انھوں کسی ایک جذبے یا کسی ایک کیفیت کے لئے الفاظ استعمال کیا۔انھوں نے تشبیہات واستعارات سے انسانی رویوں اور معاشرتی حقیقتوں پیش کیا ہے۔وہ اپنی شاعری سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نظر آتے ہے۔ شیلے فطرت کو بلند خیال تصور کرتا ہے۔اس کے اسلوب بیان اور طرز شاعری میں جاذبیت ہے۔وہ حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔اپنی شاعری میں وہ فطرت کے نظاروں، جوانی کے حسین گیتوں اور خوشی کے نغموں کی بات کرتا ہے ساتھ ہی وہ مایوسی سے اس کے واپس نہ آنے کے دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ان کا اندازِ بیان اور طرز ادا الگ اور نمایاں ہے۔ شیلے شاعری کے فن کو سمجھتے اور اس کیا صولوں کا گہرا شعور رکھتے ہے۔اس نے جب فطرت کے نظاروں کی بات کی تو اس کی گہری بصیرت سے کچھ چھپا نہ رہا۔وہ جوانی کے حسین لمحوں کی بات کرتا ہے تو کہیں وہ بہار میں پرندوں کے چہچہانے کی بات کرتا ہے۔کہیں اس نے آسماں کے رنگوں کو بیان کیا تو کہیں برسات کی بوندیوں کو لکھتا ہے۔غرض اس نے اپنے تخیلاتی خوبی کو حقیقت سے جوڑ کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

جب ہوتا ہے موسم میں بہاروں کا ترشح
اک نغمہ ابھر جاتا ہے خاموش فضا میں
سبزوں پر چمکتی ہوئی پانی کی یہ بوندیں
پھولوں کے تبسم کو بنا دیتی ہیں رنگیں (8)

جہاں منیر نیازی بہار کا تذکرہ ایک روشن خیال سے کرتے ہے وہیں ہمیں پی بی شیلے بہار کی آمد کی خوش خبری دیتے ہے۔دونوں ایک منفرد اسلوب بیان سے اپنے اپنے عہدوں میں اپنے لئے جگہ بنانے میں کامیاب رہے۔منیر نیازی خوشی کے گیت اور جشن کے نغمے پیش کرتا ہے، ویسے ہی شیلے اپنے مخصوص انداز سے گیتوں اور نغموں میں خوشی تذکرہ کرتا ہے۔

موضوعات کا انتخاب:

منیر نیازی کے کلام سے شعری رویوں کا اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے پسندیدہ

موضوعات سے اپنے جذبات واحساسات کو گرفت میں لینے کی سعی کی ہے۔ایسے موضوعات پران کے ہاں تکرار ملتی ہے۔شبِ ویراں، بازگشت اور ملن کی رات جیسی نظموں میں ان کی تخلیقی قابلیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ پچھتاوئے اور گزر جانے والے وقت کی بات کرتے ہے۔ انسان اکثر بیتے لمحوں کی یاد میں پریشان اور دکھی رہتا ہے۔ان کے یہاں اسلوب اور اصنافِ ادب کا خیال رکھا گیا ہے۔موضوعات میں تخلیقی صلاحیت کے ساتھ تجربات کی میٹھاس بھی نمایاں ملتی ہے:

جتنا وقت ملا ہے تجھ کا
اس کو کام میں لا
مجھ کو کھو دینے سے پہلے
میرے سامنے آ
رو رو کو پھر ہاتھ ملے گی
جب دن بیت گیا(9)

شیلے نے اپنی شاعری سے قارئین کے ہاتھوں میں امید کا دامن تھمایا ہے اور دنیا کو بے خبر کہ کر مخاطب کیا۔ وہ زندگی کے ہنگاموں اور بے معنی مصروفیت کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کے مصرعے روشن خیال اور فکری تخلیق کی مثال ہیں۔ان کے کلام میں وقت کے ساتھ ساتھ سنجیدگی آئی۔اس کے کلام میں داخلی خیالات کا اظہار اور ادبی معنی بھی شامل ہے۔وہ اپنی نظم میں مغربی ہوا سے کہتا ہے کہ وہ اسے ہمت دے تا کہ وہ اپنا پیغام انسانیت تک پہنچا سکے۔ اس نظم میں شاعر نے گہرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ شیلے نے ہوا کا مضبوط صیغہ پیش کیا ہے۔ ہوا جو ہمیشہ زندگی کی علامت ہے۔ جانداروں کی زندگی اس کے بغیر ممکن نہیں۔اس کے ہونے سے زندگی رواں دواں رہتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس روئے زمین پر ہوا کا کردار بہت مضبوط ہے۔شاعر نے ہوا کو پیشین گوئی کا بجا کہا۔وہ کہتا کہ ہر اندھیری رات کی ایک روشن صبح ہوتی ہے، ہر خزاں کی ایک بہار ہوتی ہے، ہر ظلم کا حساب ہوتا ہے، ہر مظلوم کے لئے انصاف ہوتا ہے۔شاعر اپنے قارئین کو ایک روشن زندگی تصویر دیکھتا ہے:

بکھرا ہوا، جیسے نہ بجھنے والا دل
راکھ اور چنگاریاں، میرے الفاظ انسانوں کے لئے
میرے لبوں سے پہنچا دو بے خبر دنیا کو
پیشن گوئی کا بجا! او ہوا
اگر سرما آیا ہے، تو بہار کیسے پیچھے رہ سکتا ہے (10)

علامت نگاری:

منیر نیازی کے ہاں نظم، غزل اور گیتوں میں علامتیں، استعارے اور فطرت نگاری کا مزاج محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان کے گیتوں میں استعار یدوسرے شعراء سے ملتے جلتے ہے مگر مستقل مزاجی کی وجہ سے جاندار اور علامتی اسلوب کی گہرائی ان تاثرات سے بھر پور ہے۔ ان کے ہاں غزلوں کا انداز بیان اور منفرد علامتی اسلوب ملتا ہے۔ انھوں نے اسلوب کی تشکیل میں سادہ الفاظ کو اپناتے ہوئے موجود علامتیں واضح پیش کیں۔ ان کے ہاں عمرِ رائیگاں کا ماتم اس تناظر میں ملتا ہے کہ نہ ہماری آزمائش ختم ہوتی ہے اور نہ ہی مقصدِ حرکت۔ ان کی غزل کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خود اپنی سوچ کی گہرائی اور جذبات کے اظہار کے سانچے واضح کیے۔ تقسیم کے بعد لوگوں کے بدلتے ہوئے رویے اور احساس کی وجہ سے ان کے یہاں ایک طرح کی حیرانگی، ماضی کے تلخ تجربوں کے نشان اور طبیعت کی سادگی ہونا ایسا شعری رویہ ہے جو ان کے ہم عصروں میں کم نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری وجود کی آواز ہے۔ ایسی آواز جس کے ساتھ خوف ہمیشہ جڑا ہو۔ انھوں نے اپنے کلام میں علامتوں کے ذریعے گہرے اور پیچیدہ معانی و مطالب کو آسان کرنے کی کوشش کی۔ ان کی شاعری میں مرکزی علامتوں میں موت، پرندوں کی ہجرت، ستارے، آدھی رات کا شہر، جنگل کی زندگی اور جادو، پانی، صبح کا گلابی منظر، شام کا سورج، مکان کی ویرانی، شجر، آئینہ اور خواب وغیرہ شامل ہیں:

ہر طرف خاموش گلیاں زردرُو گونگے مکیں
اُجڑے اُجڑے بام و در اور سُونے سُونے شہ نشیں
ممٹیوں پر ایک گہری خامشی سایہ فگن

رینگ کر چلتی ہوا کی بھی صدا آتی نہیں (11)

شیلے کے یہاں علامت نگاری کو دیکھا جائے تو انھوں نے بھی منیر نیازی کی طرح اپنی نظموں کے خیال اور معنی کو بڑھانے کے لئے استعاروں، تشبیہات اور علامتوں سے مدد لی ہے۔ علامت نگاری کے اس تجریدی نظام نے ان کی نظموں میں کشش اور دلچسپی پیدا کی ہے مگر اس کے ساتھ ان کو سمجھنے میں مشکلات بھی پیدا کرتی ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی زیادہ تر علامتوں کی اپنی ایک دلکشی ہے اور اسے شیلے کی تخیلاتی ذہن اور گہری بصیرت کے طور پر قبول کرتے ہے۔ جیسے کشتی اور ندی کی علامت۔ طوفانی دریاؤں یا سمندروں میں کمزور کشتی کا موضوع شیلے کی نظموں میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ کشتی میں سفر شیلی کے پسندیدہ تفریح کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خطرات سے لطف اندوز ہوتا ہے کیونکہ کشتی کا لہروں کو کھچنا اسے مغلوب کرتا ہے۔ کشتی میں اسے اپنی شخصیت نظر آتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے سفر میں آگے بڑھتے ہوئے راستے کی کھڑی رکاوٹوں کو بہادری سے چیلنج کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کشتی کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے، سمندر کے اس پار یا کسی دریا کے نیچے، زندگی میں روح کے سفر کی علامت کے طور پر۔ اس کے لئے کھردرا پانی روحوں کے جذباتی بحرانوں کی نشاندہی کرتا ہے:

مردہ پتی کی طرح میرا اگر ہوتا وجود
تیری طاقت سے مجھے پرواز ہو جاتی نصیب
میں فضا میں گھومتا گر تیز بادل کی طرح
ہم سفر میں تیرا بن جاتا کسی بھی حال میں (12)

محبّ وطن:

منیر نیازی کے یہاں وطن سے محبت اور اس کے باشندوں سے پیار واضح نظر آتا ہے۔ وطن سے محبت کا اظہار ان کے کئی مجموعوں میں ملتا ہے۔ 1947ء میں ہجرت کر کے آنے والے لوگوں اپنے ساتھ وطن سے محبت اور وفاداری ساتھ لائے تھے۔ منیر نیازی کا شمار بھی ہجرت کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ہجرت کا ذکر نمایاں اور ایک استعارہ

کے طور پر ملتا ہے۔منیر نیازی کے یہاں بھی ہجرت کیا حساسات نمایاں ہیں۔اس لیے جب وہ اپنی شاعری میں ماضی کے حوالے سے لکھتے ہے تو اپنا خاندان، گھر، زمین، اپنے عزیز لوگ،، بچپن کی خوب صورت یادیں اور اپنے عزیزوں کو یاد کرتے ہے۔ یہ وہ لوگ ہے جو وطن کے لیے جان دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔وطن کی آن، بان، شان کے لئے اپنی جان کا نظرانہ پیش کرنا بڑے اعزاز کی بات ہے۔منیر نیازی اپنی نظموں میں وطن اور اس کے باشندوں کے لئے دعائیں اور سلام پیش کرتے ہے۔ان کے ہاں وطن پر قربان ہونے والے شہداء کے لئے سلامیاں پیش کی گئی ہے۔وہ اللہ کے حضور اس کی سلامتی اور حفاظت کے لئے دعا گو ہے۔دشمن، بھوک، افلاس اور تنگ دستی سے نجات کے لئے پریشان نظر آتے ہے۔ وہ اپنے کلام میں وطن کی ترقی اور اس کی بہتری کے لئے تڑپ نظر آتے ہے۔

میں ہوں فانی، حسن تیرا مستقل
یاد رکھنا مجھ کو بھی اے شمع دل!

سایہء افلاک نو میں اے بہارِ دائمی، تجھ پر سلام (13)

منیر نیازی کی طرح شیلے کے یہاں بھی ہمیں دھرتی ماں سے پیار اور تڑپ نظر آتی ہے۔وطن سے دوری کسی بھی محبّ وطن کے لئے بڑی سزا سے کم نہیں، خاص کر ان لوگوں کے لئے جو حساس ہونے کے ساتھ وفادار بھی ہوں۔ان کے لئے دھرتی ماں کی سلامتی سب سے اہم ہے اور اس کے لئے جان قربان کرنا ایک عزاز سمجھتے ہے۔شیلے کے ہاں بھی وطن سے اظہارِ محبت کے نغمے ملتے ہے۔وہ اپنے وطن کی زمین کے لئے تڑپتے اور اس سے ملنے کے لئے بے تاب نظر آتے ہے۔وہ اپنی زمین میں خود فصل اُگا کر کھانے کی خواہش کرتے ہے۔ایک جگہ اور وطن سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہے کہ خواہش ہے اپنے دیس میں خود کھیتی باڑی کر کے اپنے لئے خورک پیدا کروں۔شاعر اپنے ہاتھوں سے مٹی کو چھو کر اس کی محبت اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہے۔گویا شاعر کے کلام میں دیس کے لئے محبت اور تڑپ نظر آتی ہے۔

"مجھے واپس اس دھرتی ماں کی طرف جانے دو جہاں میں اپنے
ہاتھوں سے کھیتوں اور جنگلوں سے اپنی خورک حاصل کر سکوں" (14)

منیر نیازی کے ہاں انسان کو نفسیاتی طور پر دیکھا گیا ہے۔وہ جب اپنی نظموں کو لکھتے تو معاشرے کے رویے اور روایات کو بھی مدنظر رکھتے۔ان کے یہاں انسان کی ذہنی الجھنوں اور مسائل کا گہرا تجزیہ ملتا ہے۔ان کے کلام میں معاشرتی و معاشی مسائل اس طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ان کی شاعری میں دل کی خواہشات کو پورا کرنے کی جستجو ملتی ہے۔ان کا یہ رویہ اور خوبی ان کی شاعری کو وسعت اور بصارت عطا کرتی ہے۔ان کے یہاں شہر کی افسردگی اور کھوکھلے پن کی شدت محسوس کی جاسکتی ہے۔ان کے انسانی اخلاق اور اقدار پر گہرا مشاہدہ ملتا ہے۔انسان اپنی زندگی کے بہت سے معاملات میں کمزور پڑ جاتا ہے کبھی رشتوں کے ہاتھوں تو کبھی دوستوں سے۔ وہ کبھی خود کو پچھتاوے کی آگ میں جھونک دیتا ہے تو کبھی دل کی غیر ضروری خواہش سے برباد ہوتا ہے۔نفسیاتی طور پر انسان نے دل کی الگ دنیا بسا رکھی ہے اور دماغ کی الگ، اسی اُلجھن میں وہ خود سے بہت سے مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔منیر نیازی نے ان پچھتاؤں کا تذکرہ کئی بار کیا ہے:

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں
کسی کو موت سے پہلے کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ اس کو جا کے یہ بتانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں (15)

شاعری میں نفسیاتی پہلو:

مینر نیازی کی طرح شیلے کی شاعری میں بھی نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے انسان کے بنیادی مسائل کی بات کی ہے۔وہ اس مصنوئی اور بناوٹی چہروں میں انسانی کے حقیقی رنگ کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ کائنات کو بچوں کی طرح حیرانی اور تجسس سے دیکھتے۔ان کے ہاں ہر مسئلے، ہر عمل، اور ہر الجھن پر گہرا مشاہدہ نظر آتا ہے۔وہ ایک شے میں دوسری شے تلاش کرتے ہے۔اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے قارئین کے ذہین میں ایک ایسا انسان ابھرتا ہےجو اس دنیا سے بے خبر اپنی دنیا میں مگن ہو۔ان کے یہاں انقلابی خیالات اور احساسات کی چھاپ نمایاں ہے اور انہی پر اس کی فکری اور شعری بنیاد قائم ہے۔ شیلے اپنے

اردگرد کے نظام سے متاثر لوگوں کے دکھ اور تکلیفوں کو سمجھتے ہوئے ان میں تبدیلی کا خواہاں ہے۔روح کی اس تکلیف کے لئے شیلے نے اپنے کلام میں کئی بار تذکرہ کیا ہے۔انھوں نے زندگی میں تنہائی سے اور روح کی تکلیف سے فرار چاہی ہے۔اس نے اپنی تکلیف اورغم اپنی ذاتی احساس کے طور پر پیش کیا۔وہ سچی اور کھری صفات کے ساتھ شعوری اور لاشعوری طور پر معاشرے کی ترقی اور فلاح لے لیے کوشاں رہے:

"اس طرح سے ڈھل دوں کہ نہ رہ جائے کوئی داغ
ماضی میں اِنہیں زخموں سے کھیل رہا تھا
یہ آج بھی ہیں میرے شب و روز کے ساتھی
اب موت ہی اِن زخموں کا شاید ہے مداوا
موت آئے مری زیست کو چپکے سے سلا دے(16)

مافوق الفطرت کردار:

منیر نیازی کے ہاں مافوق الفطرت کردار جیسے چڑیلیں،جنگل،ستارے، پیچھے مڑ کر مت دیکھنا،شامِ فراق، دشت مرگ،شہر در بند،شہر کا سانپ کی صفات اور چاند کا ڈھلنا جیسی لفظیات وتراکیب سے مخصوص طرح کی امیجری تخلیق کی گئی ہے اوران کی مدد سے ایک پُراسرار فضا تشکیل دی گئی ہے فضا سازی اور تخیل کی تعمیر ان کے علامتی مزاج عکاسی کرتی ہے۔انھوں نے شہری زندگی کو مسلسل تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔وہ شہر کی مادی زندگی، ظاہری آسائش وآرام کی فراہمی کو پریشانی، اکیلا پن اور ذہنی دباؤ کے ساتھ جوڑتے ہے۔وہ اکثر اپنی نظموں اورغزلوں میں شہری زندگی کو آفت زدہ جنگل کہتے ہے۔ان کی نظم "اشارے" بھی اسی زمرے میں لکھی گئی جس میں شہری مکانوں کی ویرانی اور خواہشات کی فراوانی کا تذکرہ ہے۔وہ شہر کے نظام زر کو انسانی زندگی کے زوال کا سبب سمجھتے ہے۔نظامِ زر جو ہماری زندگیوں میں اس قدر حاوی ہو چکا ہے کہ ہم احساسات اور جذبات سے عاری ہو کر مادی چیزوں کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔اس لحاظ سے وہ شہری نظام کو دشمن مانتے ہے:

سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستا نہیں

ویراں پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں (17)

شیلے کے یہاں بھی منیر نیازی کی طرح مافوق الفطرت کا عکس ملتا ہے۔ اگرچہ ان کا انداز مختلف ہے جس کی مثال "حیمن ٹو انٹلیکچوئل بیوٹی" ہے۔ اس نظم میں شاعر ایک روح سے مخاطب ہوتا ہے۔ شاعر اپنے جذبات کا موازنہ ان بھوتوں سے کرتا ہے جن کو وہ لڑکپن سے ڈھونڈتا آرہا ہے۔ جیسے ہم بچپن میں جن، بھوت اور پریوں کی کہانیاں سنتے ہیں اور پھر ان جن، بھوتوں کو حقیقت کی دنیا میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ شاعر بھی اسی احساس سے لکھتا ہے۔ وہ روح سے عقیدت سے پیش آتا ہے اور دعا کی طرح اس کی مدد کی درخواست کرتا ہے۔ ایک تاثر یہ بھی ملتا ہے کہ شیلے روحوں پر یقین نہیں رکھتا مگر جب دعا کی بات آتی ہے تو وہ ان بھوتوں کو الہامی فطرت سے جوڑتا ہے۔ ویسٹ ونڈ میں شاعر نے ہوا اپنی قوت سے جو پتے اور بیج بکھیرتی ہے ان کو بھاگتے ہوئے بھوت کہہ کر مخاطب کیا۔ اسی نظم میں ان بکھرے ہوئے بیجوں سے پیدا ہونے والے پھول اور نئے پودے جنم لیتے ہیں۔ ان کو بھی شاعر نے ایک الہامی فطرت سے جوڑا۔ بچپن میں وہ اکثر جنگلوں، ویرانوں کی کہانیاں سنا کر خوش ہوتا اور اس طرح وہ ذہنی سکون حاصل کرتا۔ اس میں وہ روحانی قوت کا ذکر کرتا ہے جو دیکھی نہیں جاسکتی بلکہ انسان سے نامعلوم اور پوشیدہ ہے۔

کچھ طاقت وران دیکھا خوف ناک سایہ
ہمارے درمیاں تیرتا ہے یہ ان دیکھا
وہ مختلف دنیا کا دورہ کرتا ہے غیر متواتر پروں سے
جیسے موسم گرما کی ہوا ایک پھول سے دوسرے پھول تک جاتی ہے (18 ترجمہ)

رومانی شاعر:

رومانی شاعروں کو قدرت الہامی قوت سے نوازتی ہے۔ شاعروں کو تو بے جان چیزوں میں بھی نزاکت اور محبت نظر آجاتی ہے۔ منیر نیازی کی شاعری میں ذات کے ساتھ ساتھ کائنات کے رنگ ہے۔ جن پر محبت کا رنگ غالب ہے۔ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور جدید

حساسیت کو اپنے انداز سے دیکھتے اور ضرورت سے زیادہ آواز بلند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات جادوئی اثر رکھتی ہیں۔انھوں نے کبھی بھی روایت اور ثقافت کا دامن نہیں چھوڑا۔ حالانکہ ان پر روایت سے بغاوت کا الزام لگایا گیا مگر جب ان کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو وہ کبھی بھی باغی معلوم نہیں ہوئے۔البتہ وہ معاشرے کے فرسودہ روایات اور آزادی کے لئے آواز بلند کرتے نظر آتے ہے۔انھوں نے شعوری اور لاشعوری طور پر معاشرے کی ترقی اور فلاح کے لیے احتجاج بھی کیا۔محبت کے موضوع پر جب لکھا تو انھوں نے محبوب کوئی صورتوں میں پیش کیا۔منیر نیازی محبت کے معاملے میں کہیں خوش تو کہیں مایوس نظر آتا ہے۔ایک روایاتی عاشق کی طرح ان کا مزاج محبوب کے مزاج کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔اگر تو محبوب سے مل لیا، بات چیت ہوگئی تو وہ خوش اور اگر محبوب نے بے روخی دیکھائی تو ان کا مزاج بھی نالہ ہو گیا۔ جیسے وہ یہاں اظہار کرتے ہے:

جی تو کہتا ہے کہ اس کو ساتھ ہی رکھیں مگر
اپنے پاس اُس حُسنِ عیش انگیز کی قیمت کہاں

تلخ اس کو کر دیا اربابِ قریہ نے بہت
ورنہ اک شاعر کے دل میں اس قدر نفرت کہاں(19)

پی بی شیلے کے ہاں بھی منیر نیازی کی طرح محبت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اس کو ویسے بھی انگریزی ادب میں رومانی شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے۔وہ نیچر کے قریب رہنے میں روحانی سکون محسوس کرتا ہے۔اس نے محبت کے لئے فن کی لطافتوں اور خیال کی رعنائیوں سے اظہار کیا۔وہ بیان کی سادگی کو مدنظر رکھتے ہوئےِ اظہار خیال کے لیے مناسب الفاظ اور آسان اسلوب بیان کا استعمال کرتے۔ان کے کلام میں تاثر پذیری کے اثرات نمایاں ہے۔اان کے یہاں عشقیہ عنصر اور رجحانات ایک مختلف انداز میں ملتے ہیں اور انھوں نے کم وبیش ہی رمزو کنایہ سے کام لیا۔ شیلے میٹھے مزاج کا انسان تھا۔اسے دنیا کے شوروغل سے نفرت تھی۔ وہ عام انسانوں اور چیزوں میں خوبصورتی نکال لیتا اور الفاظ سے وہ ایک ایسی خوبصورت تصویر پیش کرتا کہ آج اتنے سو

سالوں بعد بھی قارئین کی نظروں میں وہ تصور بن جاتا ہے۔اس کی شاعری میں رومان کی وادی ہے جس میں قارئین سانس لیتے اور ایک الگ فضا میں اُڑتے ہوئے محسوس کرتے ہے:

آ کاش بھی اوڑھے ہوئے شفاف رِدا ہے
کرنوں کی ضیا سے ہے چمکتا ہوا پانی
موجوں کے تھر کنے سے ہے دریا میں روانی
چلتی ہیں خنک بار ہوائیں جو دبے پاؤں
ہر غنچۂ نورس کا بدن چوم رہی ہیں (20)

اسلوب بیان:

منیر نیازی کے کلام میں اسلوب کی بات کی جائے تو وہ جدت اور اسلوب سے بھر پور ہے۔اُنھوں نے جہاں غزل میں فنی سطح پر تخلیقی قوت آزمائی کی وہی پہ نئے موضوعات و اسالیب کو متعارف کروانے کی سعی بھی کی۔ان کے یہاں روایت اور ثقافت کی پاسداری ملتی ہے جو کسی بھی کلام میں حسن لطافت،شگفتہ بیانی اور انفرادیت کی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔منیر نیازی کی غزل میں پائی جانے والا ورایتی انداز ان کی فکری وفنی تخلیقات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اُنھوں نے فکر وفن کے ملاپ سے ایک خوب صورت تخلیقی کام انجام دیا۔اس لیے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں تشبیہات صرف آرائش کا ذریعہ نہیں بلکہ فکری وفنی عمارت کا ایک اہم ستوں بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ اصنافِ فن کے ساتھ معنی ومطالب کی وضاحت کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ان کا کلام میں تہذیب کی راہنمائی بھی ملتی ہے:

مثال سنگ کھڑا ہے اُسی حسیں کی طرح
مکان کی شکل بھی دیکھو دِل مکیں کی طرح
ملائمت ہے اندھیرے میں اُس کی سانسوں سے
دمک رہی ہیں وہ آنکھیں ہرے نگیں کی طرح
نواحِ قریہ ہے سنسان شامِ سرما میں
کسی قدیم زمانے کی سرزمیں کی طرح (21)

شیلے نے بھی شاعری میں خیالات واحساسات کے اظہار کے لئے الفاظ کا چناؤ اور بہتر اسلوب بیاں کا ہونا لازمی جز و سمجھا۔اس میں اشعار کی جسمانی شناخت، اظہار لے لئے انداز اور اس سلسلے میں استعمال ہونے والے آلات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔اسلوب نگاری کے لئے شاعر تشبیہات، استعارات، علامتیں اور شاعرانہ الفاظ کا سہارا لے کر اپنی داخلی و خارجی خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ شیلے کی شاعری میں ایک ترتیب نظر آتی ہے۔انھوں نے سونیٹ اور آزاد نظمیں بھی لکھی۔ان کے یہاں روایت اور انفرادیت کا ملاپ ہے۔ان کی شاعری میں آہستہ آہستہ سنجیدگی آئی۔شعری سفر میں وہ ایک عام اور غیر سنجیدگی سے تفکر کی طرف بڑھے۔ان کے کلام میں فلسفیانہ رخ بہت واضح ملتا ہے۔اپنے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے انھوں نے سادہ اسلوب اور صاف اندازِ بیانی کو اپنایا۔ان کے ہاں زندگی کے مشکل مراحل کا سفر اور اس سفر میں آنے والی مشکلات کے بارے میں نرمی اور بے با کی کا سہارا لیا گیا:

> " شیلے صرف نغموں کا شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مفکر بھی ہے بنیادی طور پر وہ غزلیت کا بادشاہ ہے لیکن اس کے فلسفیانہ کلام زندگی کی گتھیاں سلجھانے میں رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو سُنہرے خواب بھی دکھاتے ہیں۔"(22)

شیلے کی شاعری میں ان کا عہد سانس لیتا ہے۔انھوں نے زندگی کی مختلف رنگ اور لہریں اپنیا سلوب بیان سے نمایاں کی ہیں۔اُن کی شاعری میں قواعد وضوابط اور اسرار ورموز سے واقفیت ہے اس کے یہاں فطرت کو بہت سے معنی اور مختلف طریقوں سے استعمال کیا گیا ہے۔ان کے اندازِ سخن میں خوداری اور شعور کی بلندوں کا سفر نظر آتا ہے۔ان کے یہاں روایت کی جھلک بھی ملتی ہے۔انھوں نے اپنی ذات کے متعلق تخلیقی اظہار میں اپنی دلی کیفیت اور جذبات کی شدت کا اظہار کیا۔انھوں نے معمولی الفاظ سے گہرے اور وسیع معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔اس نے فطرت کو زندگی کی عکاس کہا ہے۔ وہ ایسے تخلیق کار ہے جس نے اندرونی کشمکش بام عروج دیا۔ان کی شاعری میں مسائل اور حالات پر اس طرح لکھا کہ قارئین کو ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے فکری وفنی سوچ کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ان کی شاعری میں زندگی کی تلخ اور خوب صورت تصویر ملتی ہے۔انھوں نے فطرت کو زندگی کی علامت کہا اور ہوا سے لے کر پرندوں،اور بادلوں سے لے سمندوروں تک کو کردار کے طور پر پیش کیا۔جیسے اس نے انسان کا اسکائی لارک سے موازنہ کیا کہ کیسے انسان ماضی کی یادوں اور پچھتاؤں سے جوڑا رہتا ہے:

> "شیلے کی نیچرل شاعری میں دوسری خاص بات جو بار بار سامنے آتی ہے وہ اس کی اپنی ندرت ہے وہ فطرت کی شے کو علامت کی شکل میں پیش کرتا ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں وہ اچھی شناخت اور پہچان رکھتا ہے یہ علامت اس کی زندگی کی عکاس ہوتی ہے اوراس کے مزاج سے ہم آہنگ ہوکر سکون کا سبب بن جاتی ہے۔شیلےان حالات میں اپنی عادت کوعین فطرت سمجھ بیٹھتا ہے"(23ترجمہ)

منظر کشی:

منیر نیازی نے ایسے اشعار کہے جو ایک بار سننے کے بعد دیر تک یاد رہتے ہیں۔ان کے ہاں اقوال کی طرز کے مصرعے،بہتی ندی کی طرح الفاظ اور شاعرانہ تخیل سے ایسی روح پھونکتے کہ اشعار ایک خوبصورت کہانی بن جاتے ہیں۔انھوں نے چھوٹی چھوٹی نظمیں کہی اور کبھی کبھار تو صرف ایک مصرعے کی نظم کہہ کر ایک کہانی بیان کت دیتے۔ان کے قلم میں یہ خوبی ہے کہ الفاظ ان کے قلم سے نکلتے اور منظر قارئین کی نگاہوں میں جھومنے لگا تا۔ان کے الفاظ میں خیال کی ندرت اور تاثیر پائی جاتی ہے۔منیر نیازی شعوری اور لاشعوری طور اردو ادب میں اپنا نام اور مقام بنانے بہت حد تک کامیاب رہے:

> "منیر نیازی کی غزلوں کے بہت سے اشعار یاد رہ جاتے ہیں۔ یہ خوبی تو غزل کی صنف میں ہے پر نظموں کا یاد رہ جانا حیرت ناک ہے۔منیر نیازی کی اکثر نظمیں ذہن پر نقش ہوجاتی ہیں اور جب یاد آتی ہیں تو اپنے پورے تاثر کے ساتھ۔ان کی

نظموں میں لفظوں کی روانی کے ساتھ ساتھ گزرتے
ہوئےمنظروں کی روانی ہے جیسے کوئی فلم نظروں کے سامنے سے
گزر رہی ہو جیسے کوئی سفر میں ہواور کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ
رہاہو۔ یہ پیرائیہ اظہار منیر نیازی نے لاشعوری طور پر اختیار کیا
ہے یا شاید ی اندرونی آنکھ کیا ہے۔ کہ شاعر بیک وقت چیزوں
کو دو انداز میں دیکھ رہا ہے۔"(24)

شیلے کے ہاں کائناتی منظر کشی عام ہے، ان کی نظموں میں ان منظروں کی چمک اور مظاہر کے اثر کا بیان ملتا ہے۔ان کے ہاں منیر نیازی کی طرح نیلے آسماں کا سمندر سے رشتہ بھی ہے اور اثر بھی۔منیر نیازی نے اپنے مجموں کے نام فطرت کے نام سے رکھے ہے، جیسے "جنگل میں دھنک"، "تیز ہوا اور تنہا پھول" وغیرہ،اسی طرح ان کی نظموں موضوعات بھی فطرت سے ملتے ہیں۔ دوسری طرف شیلے کے شعری موضوعات کو دیکھے تو ان کے ہاں بھی فطرت کو ہی اہمیت دی گئی ہے۔ان کی نظموں میں "بادمغرب"، "اسکائی لارک" اور "بادل" وغیرہ شامل ہے۔ شیلے نے تخیل کو ایسے خوبصورت الفاظ کے غلاف میں لپیٹ کر پیش کیا ہے کہ ان الفاظ میں تصور کی حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔ مسلسل تجربات نے شیلے کو سیکھا دیا کہ کس میدان میں وہ آزادی سے اپنا تخیلاتی جوہر دیکھا سکتا ہے۔ایک اور جگہ اس نے لکھا:

تمہاری آواز سے بھری ہے
جب رات چھا جاتی ہے
ایک اکیلے بادل سے
چاند کی شعاعوں کی بارش ہوتی ہے اور اس کی روشی سے جنت بھر جاتی ہے"(25)

منیر نیازی اور پی بی شیلے کی شعری خصوصیات کے تقابلی جائزے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ انھوں نے ادب پر گہرے اور متاثر کن اثرات چھوڑے ہیں۔ دونوں شعراء انسانی حقوق، اور معاشرے کی ہٹ دھرمی کے بارے میں احتجاج کرتے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے نظر آئے۔نسائی جذبے کے حوالے سے ان کا لہجہ شفاف اور پختہ

ہے۔ان کی شاعری میں زندگی کی اکتاہٹ اور بے زاری کے اثرات ملتے ہیں۔کلام میں علامتوں اور شعری اصناف کا سلیقہ سے استعمال نظر آیا۔اپنی بصیرت اور روایتی انداز سے اپنا پیغام رسائی کی۔انھوں نے اپنی تخلیق میں احساس کے ساتھ ادب میں ایک نیا راستہ اور تہذیب سے آگاہی کے لئے کوشش کی۔اسلوب بیان اور نظریات کے حوالے سے فرق کے باوجود دونوں کے بہت سے عنصر اور خصوصیات مشترک ہیں۔ایسے تخلیق کار کم ہی ہوتے ہے جن کے ہاں تخلیقات کے پیچھے کچھ اور بنیادی مقصد کارفرما ہو۔ان کے کلام میں عمدگی اور فصاحت و بیان کی خصوصیات کے حوالے سے دونوں شعراء کی اپنی اپنی خوبیاں اور خامیاں ہیں۔مگر جب اسلوب بیاں کی بات کی جاتی ہے،تو ان کا ذریعہ اظہار فکری وفنی لحاظ سے روایتی خیالات کو سیراب کرنے کی سعی کی۔منیر نیازی اور شیلے شاعری میں انسانی زندگی میں درپیش مسائل کو سچائی سے پیش کرنے اور سیاسی،معاشی اور معاشرتی استحکام کے لئے فکر مندر ہے۔

شیلے اور منیر نیازی محبّ وطن اور دیس کے مٹی کے بڑے قدر دان رہے۔دونوں مایا ناز شعرا نے اپنی شاعری میں اپنے وطن کی ترقی وخوش حالی کے لئے فکر مند رہے۔دونوں ہی کی اپنے اپنے دائرے اسلوب میں حیرت انگیز حد تک مضبوط گرفت نظر آتی ہیں۔ان کے کلام میں حقیقت پسندانہ اظہار اور زندگی کے تلخ رویے کی چھاپ نمایاں ملتی ہیں،منیر نیازی اور شیلے کی شعری خصوصیات کو دیکھتے ہوئے قارئین یہ احساس کیے بنا نہیں رہ سکتے کہ دونوں ہی کی آوازیں انسانیت کی بھلائی اور شاعری کے لیے ایک مشعل راہ ہے،جو مستقبل کے شعراء کے لیے اُمید کی کرن ثابت ہوں گی۔

منؔیر نیازی کی شخصیت میں سیاسی،سماجی،مذہبی اور تاریخی شعور اور آگاہی موجود تھی۔ ان کے کلام میں شعور واضح اور نمایاں دکھائی دیتا ہے۔وہ نڈر،بے باک اور بہادر انسان تھے حق اور سچ کہنے میں انھیں ڈر یا جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔معاشرے میں جس چیز کو وہ برا اور ناانصافی پر دیکھتے اُس کو برملا ڈنکے کی چوٹ پر بُرا کہنے میں عار محسوس نہ کرتے۔اُن کے کلام میں حق وصداقت مثالیں کی واضح ملتی ہیں۔اپنی اکثر غزلوں میں زمین کے جابر اور ظالم نظام کو بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اسی کی تلاش میں گم نظر آتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی اگر ہم منیر نیازی کے فن پر نظر ڈالیں تو یہ نکات سامنے آتے ہیں۔کہ انھوں نے نظم اور غزل کی ایک معنویت کو ہمہ جہت بنایا۔علامتوں کے ذریعے گہرے اور پچیدہ معانی و مفاہم پیش کیے۔حقیقت نگاری اور تخیلاتی دنیا کا سہارا لے کر زمان و مکاں کے فاصلے مٹانے کی کوشش کی ہے۔فن،فکر،اسلوب،ہئیت اور شعری اصناف کو استعمال کرتے ہوئے اپنی بات قارئین تک پہنچائی ہے۔اپنی شخصیت کے الجھاؤ کو سلجھانے،احساس اور شعور کی تلاش میں طویل منازل طے کیے۔

شیلے کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ لینے سے ان کی شخصیت میں بھی سیاسی،سماجی،اور تاریخی شعور اور آگاہی ملتی ہے۔ان کے کلام میں شعور واضح اور نمایاں دکھائی دیتا ہے۔انھوں نے فن کی دنیا کے امتیازات اور طبقات سے بالاتر ہو کر اپنی زندگی کی حقیقتوں اور تجربات کی روشنی میں کام کیا۔ان کے اہم موضوعات میں بے چینی اور حوصلہ افزائی،اختیارات کے خلاف بغاوت اور آزادی کی تلاش،محبت کی جستجو اور تخیلاتی بصیرت ہیں۔ان کی شاعری کا طرز فکر سماجی عدم مساوات اور اخلاق باختگی کے خلاف آواز بلند کرتا ہوا ملتا ہے۔شیلے کے خیال میں محبت اور خوبصورتی انسان کے خیالی اور ذہنی عناصر ہیں۔اپنی مجلس میں، وہ محبت کو تحفظ اور تخلیق کا جزو قرار دیتے۔معاشرے میں جس چیز کو وہ برا اور ناانصافی پر دیکھتے اُس کو برملا کہہ دیتا۔ اُن کے کلام میں حق وصداقت مثالیں کی واضح ملتی ہے۔ان کے یہاں جابر اور ظالم نظام کو بدلنے کا ارادہ ملتا ہے۔ان کے یہاں انسان کے بدلتے ہوئے رویے کے لیے گہری سوچ و بچار ہیاسی سوچ اور فکری انداز سے ایک خاص طرح کی فضا تخلیق پاتی ہے۔ان کے یہاں انسان خواہشات میں ایسے سفر کا حصہ بن گیا ہے جو آگے کو چلتا جارہا ہے اور واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ان کی شاعری کے الفاظ،مصرعے اور اشعار پڑھنے اور سننے والوں کو دیر تک یاد رہتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں ہمہ جہت حقیقتوں سے کام لیتے ہوئے تقریبا زندگی کے پہلوؤں پر قلم اُٹھانے کی سعی کی ہے۔وہ اپنی شاعری کے انتخاب میں سنجیدہ رہے۔ان کے کلام میں فکری وفنی نقطہ نظر سے کئی رموز پوشیدہ ہیں۔نے قلم کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور اپنے اردگرد کی سیاسی و معاشی صورت حال پر بے دھڑک لکھا۔

انھوں نے اپنے اردگرد کے گھٹن زدہ ماحول کو محسوس کیا اور اس کے خلاف جب لکھا تو ایک احتجاج کی آواز بلند ہوئی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ معاشرے میں گھٹن اور دباؤ بھگاڑ اور خرابی کا سبب بنتا ہے۔ ان کے خیال میں رومانوی طرز احساس فکری ارتقاء کی پہلی سیڑھی ہے۔ انیسویں صدی میں شیلے کو ناقدین نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ جبکہ وکٹورین دور میں ان کو مثالی محبت کا شاعر مانتے ہوئے رومانوی شاعر کہا جانے لگا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پھر ایک دفعہ ان کی شاعری بے توجہی کا شکار ہوئی جبکہ تیس کی دہائی میں دوبارہ ان کی فکری وفنی منظر کشی، گہری فلسفیانہ سوچ اور جذباتی پختگی نے تنقید کے میدان میں اپنی جگہ بنائی۔ بورا نے ان کو شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے اعلیٰ درجے کے فلسفی شعراء میں شمار کیا۔ کچھ ناقدین ان کو منطق دان کہتے ہیں۔

شیلے شاعری میں اصول پرستی، مثالیت اور تصوریت کا حامی تھا۔ اس کیلئے شاعری اخلاقی قدروں، اوج کمال اور نقطہ عروج تھی، حوصلہ مندی اور بلند نظری کا قائل تھا اگر اس کی شخصیت دیکھی تو وہ خوش باش، زندہ دل اور مستقبل مزاج رکھتا ہے مگر کئی نقادوں کے قبول خبطی، تنگ دل، کاہل اور آرام طلب جانا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کا شوق صرف شاعری پڑھنا لکھنا تھا۔ اس نے انگریزی ادب کی بہترین کو بہترین شاعری دی۔ آج بھی دنیا بھر کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہیں۔ جن کے بغیر انگریزی ادب مکمل نہیں ہوتا۔ یہ فلسفیانہ ادراک، ذہانت، شعور کے اظہار، فطری مشاہدے، کلاسیکی رومانویت، سادہ لوگوں کی زندگی معنی خیز شاعری زندگی کی حقیقتوں کی ہمہ گیر شاعرانہ کارنمایاں پر مبنی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔منیر نیازی،سفید دن کی ہوا اور سیاہ شب کا سمندر، گورا پبلی کیشنز، لاہور،1996ء ص:28
۲۔https://www.poetryfoundation.org/poems/46565/ozymandias
۳۔منیر نیازی، جنگل میں دھنک، ماور پبلی کیشنز، لاہور،1993ء،ص:86
۴۔ایضا،ص:103
۵۔Percy Shelley, Bysshe, Selected Poems, New Kitab Mahal, Lahore, 1980, p.260
۶۔ایضاً ص258
۷۔منیر نیازی،کلیات منیر، ماورا پبلی کیشنز، لاہور،1986ء،ص:70
۸۔Percy Shelley, Bysshe, Selected Poems, as above, p.258
۹۔منیر نیازی، جنگل میں دھنک، محولہ بالا،ص:93
۱۰۔Percy Shelley, Bysshe, Selected Poems, as above. p.258
۱۱۔منیر نیازی، دشمنوں کے درمیان شام، گورا پبلی کیشنز،1988ء،ص:54
۱۲۔Percy Shelley, Bysshe, Selected Poems, as above, p.326
۱۳۔منیر نیازی، ماہ منیر، مکتبہ منیر، لاہور،1974ء،ص:25
۱۴۔https://www.marxists.org/archive/shelley/1813/queen-mab.htm
۱۵۔منیر نیازی، ساعت سیار، ماورا پبلی کیشنز، لاہور،1993ء،ص:24
۱۶۔شبنم گورکھپوری، باد مغرب،ص:142

۱۷۔منیر نیازی، دشمنوں کے درمیان شام،محولہ بالا،ص:60

۱۸۔ایضاً،ص:123

۱۹۔منیر نیازی، ماہ منیر،محولہ بالا،ص:80

۲۰ https://www.poetryfoundation.org/poems/45134/ode-to-the-west-wind

۲۱۔منیر نیازی، ماہ منیر،محولہ بالا،ص:81

۲۲۔شبنم گورکھپوری، بادمغرب،محولہ بالا،ص:102

۲۳۔Percy Bysshe Shelley, Selected Poems, as above, p.259

۲۴۔فیض احمد فیض، دیباچہ،ساعت سیار(منیر نیازی)،محولہ بالا،ص:9

۲۵.www.poetryfoundation.org/poems/45134/ode-to-the-west-wind

☆☆☆☆☆☆

کتابیات

☆ امجد جمیل، پاکستانی ادب کے معمار منیر نیازی شخصیت وفن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2006ء

☆ حسن رضوی، گفت وشنید، (انٹرویو)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1990

☆ شبنم گورکھپوری، بادِ مغرب، شبنم گورکھپوری، گورکھپور (انڈیا)، 1990ء

☆ منیر نیازی، جنگل میں دھنک، لاہور: مکتبہ منیر، 1960ء

☆ منیر نیازی، ماہ منیر، مکتبہ منیر، لاہور، 1974ء

☆ منیر نیازی، چھ رنگیں دروازے، خزینہ علم وادب، لاہور، 1979ء

☆ منیر نیازی، آغازِ زمستان میں دوبارہ، خزینہ علم وادب، لاہور، 1981ء

☆ منیر نیازی، کلیات منیر، مکتبہ منیر، لاہور، 1983ء

☆ منیر نیازی، کلیات منیر، ماورا پبلی کیشنز، لاہور، 1986ء

☆ منیر نیازی، دشمنوں کے درمیان شام، گورا پبلی کیشنز، 1988ء

☆ منیر نیازی، ماہ منیر، خزینہ علم وادب، لاہور، 1988ء

☆ منیر نیازی، ساعت سیار، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ستمبر 1991ء

☆ منیر نیازی، جنگل میں دھنک، ماور پبلی کیشنز، لاہور، 1993ء

☆ منیر نیازی، ساعت سیار، ماورا پبلی کیشنز، لاہور، 1993ء

☆ منیر نیازی، تیز ہوا اور تنہا پھول، گورا پبلی کیشنز، لاہور، 1994ء

☆ منیر نیازی، سفید دن کی ہوا اور سیاہ شب کا سمندر، گورا پبلی کیشنز، لاہور، 1996ء

☆ نفیس اقبال، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو گیت نگاری، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1986ء

رسائل وجرائد:

☆ آئندہ، کراچی، پاکستانی ادب نمبر، جلد 11، شمارہ 41، جنوری تا مارچ 2006ء
☆ اخبار جہاں (ہفت روزہ)، کراچی، 22 تا 29 فروری 1976ء
☆ ادبیات (سہ ماہی)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ 19، 1992
☆ دنیا (روزنامہ) اسپیشل فیچر، 15 مارچ 2016ء
☆ فاصلہ، (ماہنامہ)، پشاور، مئی 1987ء

☆☆☆☆☆☆☆